جلد (۸) مارچ سنہ ۱۹۰۵ء نمبر (۶)

ایڈیٹر

شیخ عبد القادر بی-اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

نثر مضامین

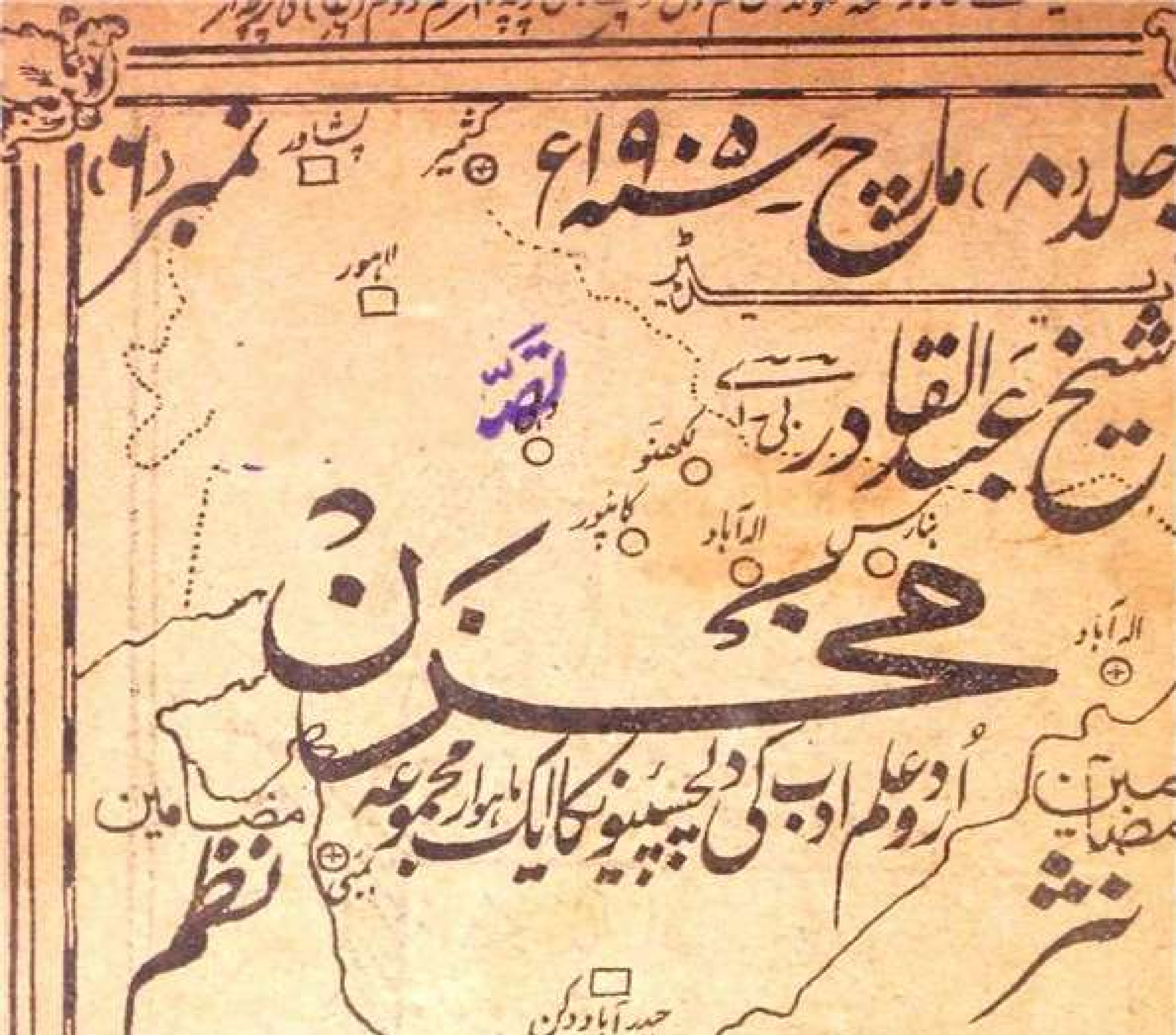

ہربرٹ سپنسر - شیخ عبد القادر (از لندن) ۱
انسانی افعال اطاعت - لالہ دیوا چند بی-اے پلیڈر ۹
...وسیع - زمین - چاند - میاں عبد العزیز ایم-اے بیرسٹر اسسٹنٹ کمشنر ۲۱
دو ہفتے سیاحت میں - پردیسی سیلانی - ۲۷
معشوقہ عرب کی یاد میں - سید سلیمان بہاری (از لکھنؤ) ۴۶
...می زندگی - شیخ محمد اقبال ایم-اے
حضرت داغ مرحوم ۴۹

نظم مضامین

نیا شوالہ - شیخ محمد اقبال ایم-اے - ۵۰
رباعیات سید علی حسن آحسن مارہروی ۲
مصنف جلوہ داغ ... ۵۱
پھول کانٹے - منشی نانک چند شاد طالب بی-اے - ۵۲
ٹیپو سلطان - حافظ محمود شیرانی (از لندن) ۵۳
مذہب اور سائنس - محمد اکبر خاں بی-اے مرحوم ۵۶
دیوار کہن - منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی ۵۲

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں
ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ▭ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے۔

خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں منشی محمد عبد العزیز کے اہتمام سے طبع ہوا
اور شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر نے شائع کیا

میرے شہر میں
موت کا خوفناک نظارہ۔ ہر طرف سے لوگوں کی آہ
وزاری اپنی نوجوانی۔ عورت اور بچوں کی بیکسی
کا خیال مجھے پریشان کیے جاتا ہے۔ ہر ایک آدمی
زندگی سے بیزار۔ موت کا منتظر دکھائی دیتا ہے۔
کچھ نہیں سوجھتا کیا کروں کہاں جاؤں کدھر
بھاگوں ہر طرف موت منہ پسارے کھڑی ہے
فرشتہ :۔ او بزدل بے خبر
انسان! اتنا مت ڈر۔ ہوش و حواس کو قائم رکھکر میری
بات کو غور سے سن۔ کہیں بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ اٹھ
قیمت چار آنے

مخزن

ہربرٹ سپنسر

(۱۸۲۰ء سے ۱۹۰۳ء تک)

فلسفۂ جدید کی تاریخ گذشتہ صدی کے ناموروں میں ہربرٹ سپنسر سے بڑا آدمی شاید مشکل ہی
یش کر سکے - اس عالی دماغ شخص کے حالاتِ زندگی کون نہیں سُننا چاہتا - اور اگر خود سپنسر کی
بانی سُنے جا سکیں تو از یں چہ بہتر - حال میں اس کی اپنی تصنیف کی ہوئی سوانح عمری دو جلدوں
یں شائع ہوئی ہے - جس سے معلوم ہوتا ہے - کہ سپنسر اُن لوگوں میں سے تھا جو اپنی ذاتی
ہن اور قدرتی طبّاعی کے سوا تلمذ کے ممنون یا کسی یونیورسٹی کی تعلیم کے مشکور نہیں ہوتے -
ور محض اپنی محنت اور ہمت سے وُہ نام پیدا کرتے ہیں کہ دُنیا دنگ رہ جاتی ہے - اہلِ علم
کے دِلوں پر ابھی اس بلند پایہ فلسفی کے دُنیا سے اُٹھ جانے کا داغ تازہ ہے اور اس لئے
س کے حالات اَور بھی دلچسپی رکھتے ہیں - سپنسر نے اِس کتاب میں اپنے حالات کی تفصیل
ور اپنے خیالات کی توضیح میں اُسی شوقِ تجزیہ سے کام لیا ہے - جس سے علمِ کیمیا کا ماہر
حقیقتِ اشیأ دریافت کرتے وقت اور علمِ نباتات جاننے والا کسی پھول یا پتّے کی تشریح
رتے ہُوئے لیتا ہے - عبارت کے لحاظ سے یہ کتاب اس کے طرزِ تحریر کا عُمدہ نمونہ نہیں کہی
جا سکتی - کیونکہ اُس نے اِسے عجب دقتوں کے باوجود تکمیل کو پہنچایا - پہلے ۱۸۷۵ء میں اُس نے
پنی زندگی کے واقعات کا ایک ڈھانچہ سا کئی نشستوں میں کسی سے لکھوایا - وُہ بولتا جاتا

تھا اور کاتب لکھتا جاتا تھا۔ پھر اور کتابوں کی تصنیف میں مصروف ہوگیا اور سوانح عمری کی ترتیب کا کام ویسے ہی پڑا رہا۔ کوئی دس سال بعد اس کی صحت پہلی دفعہ بگڑی۔ اور دماغی محنت کی کثرت کے سبب ایسا معلوم ہوا کہ شاید قویٰ نے جواب دیدیا ہے۔ مگر ایسے آدمی سے نچلا کب بیٹھا جاتا تھا۔ سوانح عمری کے وہ اوراقِ پریشاں یاد آئے اور ۱۸۸۶ء میں اسے شغلِ بیکاری سمجھ کر پھر اٹھالیا۔ کیونکہ کوئی ایسا کام جس کے لئے زیادہ دماغ سوزی درکار ہو اُن دنوں ممکن نہ تھا۔ دن میں کسی وقت جب طبیعت بیکاری سے بالکل گھبرا جاتی تو ۱۸۷۰ء کی یادداشتوں کو ذرا وضاحت سے لکھ لیتا۔ مگر واقعات بہ پابندیِ تاریخ وقوع درج نہ ہوسکے۔ سپنسر کو ہر وقت یہ خیال ستاتا رہتا تھا۔ کہ شائد مفصل حالات کے قلمبند کرنے کے لئے اُس کی زندگی وفا نہ کرے۔ اس لئے اُس نے یہ ارادہ کرلیا۔ کہ پہلے ضروری باتیں لکھدی جاویں۔ مگر اسی اثنا میں صحت درست ہوچلی۔ اور اُس نے بعد ازاں کئی باتیں جو پہلے چھُٹ گئی تھیں۔ جابجا بڑھادیں۔ اِن اسباب سے ترتیب اور خوبیٔ عبارت میں تو خلل آگیا۔ تاہم ہمیں اُس کا مشکور ہونا چاہیئے کہ ہمارے لئے اپنی مستند تصویر چھوڑ گیا۔ جسے اُس کے بعد اشاعت نصیب ہوئی۔

عجیب بات ہے کہ ابتدائے عمر میں سپنسر بالکل معمولی قابلیت کا آدمی نظر آتا ہے۔ ریاضی میں تھوڑی سی واقفیت کے سوا جو مدرسے میں پیدا کی اور سائنس سے کچھ خفیف شناسائی کے علاوہ جو بطورِ خود قدرتی مذاق کی وجہ سے حاصل کی۔ سپنسر اس چیز سے جسے عُرف میں "تعلیم" کہتے ہیں۔ بے بہرہ تھا۔ اٹھارویں برس میں وہ اپنی تعلیمی حالت کا نقشہ یُوں کھینچتا ہے:-

ریاضی خاصی آچلی تھی۔ اور اسی لئے قوتِ استدلال مضبوط ہوگئی تھی۔ مگر زبانیں سیکھنے میں مجھے بہت کم کامیابی ہوئی۔ فرانسیسی کا تو سوائے گرامر کے ابتدائی حصّے اور ایک فقروں کی کتاب کے چند صفحوں کے میں کچھ نہ پڑھ سکا۔ یونانی میں بھی قدرے صرف و نحو اور انجیل کے

ند بابوں کا ترجمہ اور لاطینی کی کسی آسان سی کتاب کا ترجمہ میں کر سکتا تھا۔ مگر اس میں غلطیاں
ہ جاتی تھیں۔ ہنٹن میں تعلیم کا احاطہ محدود تھا۔ تاریخ تو پڑھائی ہی نہیں جاتی تھی۔ عام
لم ادب کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ عملی علوم طبعیات داخلِ نصاب نہ تھے۔ اور نظم اور افسانے
رج از علوم سمجھے جاتے تھے"۔

سپنسر کی باقاعدہ درسی تعلیم کا مندرجہ بالا تفصیل پر خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ فنِ انجنیری
تحصیل میں لگا دیا گیا۔ اور اکیسویں برس تک اسی شغل میں مشغول رہا۔ کبھی لندن کے ریل
ے کارخانوں میں اور کبھی برمنگھم میں وُہ کام سیکھتا رہا۔ شوقِ علم اس عرصے میں بھی طبعیت کو
گدائے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اس لئے وُہ اوقاتِ فرصت میں ریاضیات میں اپنا علم بڑھاتا رہا۔
س زمانے میں سپنسر نے جو خطوط اپنے باپ کو لکھے ہیں وُہ مسائلِ اقلیدس سے پُر تھے۔
ور کبھی کبھی وُہ اپنے فن کے متعلق یا علم طبعی کے متعلق بھی اُن میں بحث کرتا تھا۔ اس کا
پ فزکس (طبعیات) اور کمسٹری (علم کیمیا) کا شائق تھا اور کچھ لوگ اس سے یہ علوم
ڑھتے تھے۔ اِس لئے سپنسر کو بھی بچپن ہی سے ان میں تھوڑا سا مذاق پیدا ہو گیا تھا۔
ن دنوں وُہ کام سیکھ رہا تھا ان دنوں میں چند لکچر علمِ کیمیا پر ہُوئے اور اُن کے سُننے سے
س علم کی چند کتابیں پڑھنے کی طرف رغبت ہُوئی۔ اور اسی زمانے میں ایک کتاب علم
بقات الارض کی خریدی اور پڑھی۔ مگر ان عملی چیزوں کی طرف میلان کے سوا اس زمانے
س گہرے فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ اُس وقت کوئی اس نوجوان
نجنیر کو دیکھ کر گمان تک نہیں کر سکتا تھا۔ کہ علم مابعد الطبعیۃ کے مطالعے کے لئے جس نازک
خیالی کی ضرورت ہے اور جس قدر جذبات سے بھری ہُوئی طبعیت درکار ہے۔ اُس کا کوئی
حصہ اس شخص میں موجُود ہے۔ یہ باتیں عموماً مذہبی طبائع میں ہوتی ہیں۔ اور مذہب سے سپنسر
و بالکل ناموافقت تھی۔ یہ ناموافقت ایک حد تک تو بعض موروثی خواص کا نتیجہ تھی اور ایک حد
ک اس کی خصوصیت تھی۔ اپنے بزرگوں کے خواص وُہ یُوں شمار کرتا ہے:- آزادہ روی

خودرائی - انکارِ تقلید اور سیاسی - تمدنی اور اخلاقی امور میں اپنی رائے کا صاف اور بے دھڑک اظہار - اِس لئے کچھ تعجب نہیں - اگر ایسے بزرگوں کی اولاد مذہب سے اس درجہ بے پرواہ ہو - جیسا کہ سپنسر ذیل کی عبارت میں نظر آتا ہے :- "مذہبِ عیسائیت باعتبار میرے جذبات اور میرے قوائے ذہنی کے میری فطرت سے بیگانہ ہے - بہت لوگوں کو عبادتِ مذہبی سے ایک قسم کی فرحت ہوتی ہے - مگر مجھے کبھی نہیں ہوئی - البتہ گرجے کی موسیقی سے جو اثر قلب پر پیدا ہوتا ہے اُسے مستثنیٰ رکھتا ہوں - مگر ایک شخصی وجود کی مدح وثنا - اور اس کے سامنے اپنی اطاعت اور عجز کا اظہار ایسی آوازیں ہیں - جن کی صدا میرے دل سے کبھی نہیں اُٹھی"۔

تحصیلِ فن کے زمانے میں سپنسر کو نوکری بھی مل گئی تھی - مگر اکیسویں برس میں ہی اُس نے اس ملازمت کو خیرباد کہا - تاکہ ایک کل بنانے میں جو برقی اور مقناطیسی دونوں قوتوں سے کام لے اور جس کی تجویز اس کے باپ کو سوجھی تھی - اپنا سارا وقت صرف کر سکے - لیکن ایک مہینے کی لگاتار محنت سے یہ معلوم ہُوا کہ وُہ تجویز عملی صورت میں نہیں آسکتی - مایوس ہو کے رہ گیا - اِس کے بعد سات سال تک بے ٹھکانہ سی زندگی کٹی - کئی دفعہ انجنیری کی عارضی ملازمت منظور کی - پر سات برس میں کل ڈیڑھ برس ملازمت کا آیا - اور باقی وقت نئی تجویزیں سوچنے اور اُن کا امتحان کرنے میں ضایع ہوا - بغیر اس کے کہ اُن سے کوئی عملی نتیجہ مترتب ہو" - اِن تجاویز کا مقصد یہ تھا کہ کوئی نئی دریافت یا ایجاد ایسی ہو جس سے مالی نفع پہنچے - لیکن یہ محنت رائگان گئی اور گو بعض چیزیں ابتدا میں اُمید دلانے والی نظر آئیں - امید جلد مبدّل بہ مایوسی ہوتی گئی -

۱۸۴۲ء میں جب اس کی عُمر بائیس برس کی تھی - ہم اُسے میدانِ تصنیف میں قدم رکھتے ہُوئے دیکھتے ہیں - اُس کی پہلی کتاب ایک پولیٹکل رسالہ تھا - جس میں حکومت کے حدود مناسب مقرر کئے گئے تھے - اس میں بعض رائیں ایسی تھیں - جنہیں بعد میں سپنسر کو

رنا پڑا۔ مگر غور سے دیکھیں تو اُس کے پولیٹیکل فلسفے کے سب اصُول اس رسالے میں آگئے تھے۔
س کا بیان ہے کہ اِسی رسالے سے بعد کی مشہور کتابیں نکلیں۔ کتاب سوشل سٹیٹکس کا خیال اسی سے
یدا ہُوا۔ اور جن تمدّنی اُمور سے اُس میں بحث تھی۔ اُن پر غور کرتے ہُوئے۔ پرنسپلز اف سائی
ولوجی (یعنی علم النفس کے اصُول) کی نوبت آئی۔

۱۸۴۶ء میں سپنسر نے چند کتابوں کا مسلسل مطالعہ شروع کیا۔ تاکہ فلسفے پر کتاب لکھے ۱۸۴۷ء
میں اس کے پاس مجوزہ کتاب "مارل فلاسفی" کے لئے کافی مواد جمع ہوگیا اور یہ مواد اس کے
ماغ میں کھولنے لگا۔" اور اسی سال کے ماہِ ستمبر میں اُس نے دیباچے کے تیس صفحے لکھ کر اپنے
پ کے پاس بھیجدیئے ۱۸۴۸ء میں گو ابھی مستقبل کے متعلق وُہ معرضِ اُمید و بیم میں تھا۔ تاہم
ربی کے گرد و نواح کے کھیتوں میں گھومتے ہُوئے وُہ اس کتاب کے اگلے باب سوچتا رہا۔
ور یہ اس کی عادت تھی کہ سوچ کے لئے اس کی طبیعت سیر ہی میں حاضر ہوتی تھی۔ ۱۸۴۸ء میں
ئندہ کی تجاویز ایسی غیر متیقن تھیں۔ کہ اس کا ارادہ ہو رہا تھا کہ نیوزیلینڈ میں جا بسے۔ کبھی یہ ارادہ
وتا تھا کہ باپ کے ساتھ شریک ہو کر ایک نیا مدرسہ جاری کرے۔ مگر اختتامِ سال سے پہلے اسکو
خبار 'اکونومسٹ' کی نائب اڈیٹری مل گئی اور اس تشویش کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد اُس کی
ندگی ثابت قدمی کے ساتھ ایک منزل کی طرف ترقی کرتی گئی۔ سب سے پہلے کتاب "سوشل سٹیٹکس"
یار ہُوئی۔ لندن میں جو پہلا سال گذرا۔ اُس کی راتیں اس تصنیف کے لئے وقف رہیں۔ طرزِ
حریر کی طرف اس زمانے میں بہت توجہ تھی۔ ۱۸۵۰ء کے آخر میں یہ کتاب شائع ہُوئی۔

۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان جو دس سال کا عرصہ گذرا۔ اس کے متعلق سب سے زیادہ
چسپ بات یہی ہے کہ اس عرصے میں سپنسر کے دل میں ایک نظام فلسفی کے خیال کا ارتقاء
اری رہا۔ انہی دنوں میں جارج الیٹ (مشہور افسانہ نگار) سے اس کی ملاقات ہُوئی اور
ارج لوئیس (مصنفِ تاریخ فلسفہ) ہکسلے اور ٹنڈل (مشہور سائنس دان) سے دوستی اور رسم
یدا ہُوئی۔ جو مدّت العمر قائم رہی۔ لوئیس کی دوستی کے لحاظ سے اُس نے لوئیس کی مشہور

ومعروف کتاب "تاریخ فلسفہ" پڑھی اور اُس کا تعارف فلسفیانہ خیالات سے اسی کتاب کی بدولت ہُوا۔ وُہ خود مُعترف ہے کہ اس وقت تک فلسفی مسائل کی طرف اس کی توجہ نہیں ہُوئی تھی۔ اِس سلسلے کا چھڑنا تھا۔ کہ پھر بقیہ عُمر فلسفی تصانیف کی ہی نذر ہوگئی۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں اس کی نامور کتاب "اے سسٹم آف سنتھیٹک فلسفی" شائع ہُوئی۔ اور سنہ ۱۸۹۶ء میں اِس کی طبع ثانی کی نوبت آئی۔ سپنسر کا فلسفہ بحیثیت جدت اور زورِ بیان میدانِ قبولیت میں تو گوئے سبقت لے گیا۔ مگر واقفانِ فن کی نقادانہ رائے یہ ہے کہ اُس میں ابتدائی تعلیم میں فلسفے کی ناواقفیت کے آثار موجود ہیں اور نتائج کے استنباط میں لغزش کئی جگہ نظر آتی ہے۔ تاہم اس کی کتابیں اپنے رنگ میں لاجواب ہیں اور دیر تک وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائینگی۔

اُنیسویں صدی کے عقائد میں قانونِ ارتقاء (ایوولیوشن) سب سے زیادہ مقبول نظر آتا ہے۔ اور گو یہ کہنا آسان نہیں کہ بیسویں صدی کے اختتام پر دُنیا اس مسئلے کو اُسی طرح تسلیم کریگی جس طرح اُنیسویں صدی کے اخیر میں کرتی تھی۔ تاہم اس کی موجودہ وقعت کا لحاظ اس کے سب سے بڑے حامی کی توقیر پر مجبور کرتا ہے۔ ڈارون اس نئے زمانے میں اس کا محرک اور سپنسر اس کا بڑا موید تھا۔ اور اس بارے میں اس کے عقائد کا اندازہ مندرجہ ذیل عبارات سے جو اس کی پہلی تصنیف سے ماخوذ ہیں۔ ہو سکتا ہے:-

"ترقی کوئی اتفاقی امر نہیں۔ بلکہ لازمہ ہستی ہے۔ تہذیب بجائے مصنوعی چیز ہونے کے فطرت کا اُسی طرح ایک حصہ ہے۔ جیسے جنین کا ترقی کرتے کرتے بچے کی صورت اختیار کرنا اور کلی کا کھل کر پھول بننا۔ جو جو تبدیلیاں بنی نوع انسان میں واقع ہُوئی ہیں اور ہو رہی ہیں وُہ وُہ اسی قانون کا نتیجہ ہیں جو ساری ذی حیات مخلوقات پر حاوی ہے۔ اور بشرطیکہ نسلِ انسانی قائم اور ترکیبِ اشیاء بحالتِ موجودہ رہے۔ اِن تبدیلیوں کا لازمی نتیجہ تکمیل ہے۔ جیسا کہ یہ یقینی ہے کہ درخت اکیلا نمو پاتا رہے تو تناور ہو جاتا ہے اور اگر جھنڈ میں سے ایک ہو تو پتلا سا رہتا ہے۔ یا جیسا کہ گھوڑا حسبِ ضرورت گاڑی میں جوتنے کے لائق یا

گھوڑ دوڑ میں دَوڑنے کے لائق بنتا ہے۔ اِسی طرح یقینی ہے کہ انسان کے قوا جسمانی و ذہنی اس کی تمدّنی حالت کے عین متناسب رہنے کے لئے سانچے میں ڈھلتے ہیں اور اسی طرح لازم ہے کہ وُہ چیزیں جنہیں ہم بُرائی اور بد اخلاقی سے تعبیر کرتے ہیں رفتہ رفتہ غیر موجود ہو جائیں اور انسان انسانِ کامل بنجائے"۔ پھر اُسی کتاب کے ایک اور حصّے میں:۔

"ایک زبردست حرکت ہے جو ہمیشہ تکمیل کی طرف لیجا رہی ہے۔ اس کی عمومیّت اس درجے کی ہے کہ تمام خفیف بے قاعدگیاں اور کوتاہیاں اُس کے آگے ہیچ ہیں۔ جیسا کہ زمین کی گولائی کے خم کے سامنے کوہ و وادی دونوں بے حقیقت ہیں۔ نظرِ غائر نقائص میں بھی خواہشِ تکمیل کی جد و جہد کا ظہور پاتی ہے۔ غور کرنے والے شخص کو جو بات سب سے بڑھ کر حیرت میں ڈالتی ہے اصلی کفایتِ اشیا ہے۔ اور وُہ بظاہر پیچیدہ مگر درحقیقت سادہ اصُول جس سے ہر نقص کی اصلاح خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ وُہی اصُول جس سے نجوم بعد حرکت اپنی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ جس سے زخمی انگلی خود بخود درست ہو جاتی ہے۔ جو نظامِ تمدّن کے پلڑے برابر رکھتا ہے۔ جو نابینا آدمی کی شنوائی بڑھا دیتا ہے۔ جو قیمت کو پیداوار کی مقدار کے متناسب کرتا ہے اور جو ایک پَودے کو نئی آب و ہوا کا عادی بنا دیتا ہے۔ سوچنے والا آدمی روز بروز انتظامِ فطرت میں نیا حُسن دیکھنے لگتا ہے۔ چشمِ بصیرت کھُلتے ہی اُسے اعلیٰ موزونیّت دکھانے لگتی اور اُس کے دِل میں گہرا عقیدہ جمانے لگتی ہے۔ جب اس کے قلب پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو اُسے کسی سطحی خیال کے شخص کا اُٹھ کر یہ دعوے کرنا کہ وُہ کسی طرح فطرت کی اصلاح کر سکتا ہے اور اس بے عیب کارخانے میں ٹھگلی لگا سکتا ہے کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اِن حضرت کی صُورت تو ملاحظہ ہو۔ جو ایسے عجائبات سے تو گھرے ہُوئے ہیں اور پھر انہیں یہ جُرأت ہو کہ اس امر کا اعلان کریں کہ انہوں نے اور ان کے چند ہمعصروں نے باہمی مشورہ کر کے خدائی انتظام میں اصلاح کا کوئی طریقہ ایجاد کیا ہے! یہ دخل در معقولات دینے والے۔ یہ خود بخود دُنیا جہان کی خبر گیری

کا بیڑا اٹھانے والے۔ قوانینِ قدرت پر اس قدر کم اور اپنی قابلیّت پر اس قدر زیادہ بھروسا رکھتے ہیں۔ کہ اگر اِن کی چلنے پائے تو آج ہی سُورج اور زمین کو ایک مضبُوط زنجیر سے جکڑ دیں۔ کہ کہیں وُہ قوت جو اس وقت دونوں کو قائم رکھے ہُوئے ہے اچانک عمل کرنے سے نہ رہجائے۔ گویا اِن کے نزدیک کوئی قاعدہ جو پارلیمنٹ کے بنائے ہُوئے قوانین کے مشابہ نہ ہو قابلِ اعتبار نہیں۔ یہ ہے خلاصہ اُن حیرت انگیز عقائد کا جو اِن ترمیم کنندگانِ تخلیق کا شعار ہیں"۔

مندرجہ بالا عبارات ظاہر کرتی ہیں۔ کہ سپنسر کو بعض باتوں میں نیا تھا۔ مگر اُس پُرانے مسئلے میں کہ دُنیا کی تجویز اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی۔ متقدمین سے نہایت خوش عقیدہ لوگوں کا ہم خیال ہے۔ اِس کی تصانیف کے بعض حصّے جہاں لامذہبی کا اظہار کرتے ہیں وہیں ایسی عبارتیں خُدا کی خدائی کا بے اختیارانہ اعتراف کر رہی ہیں۔ اور انہیں پڑھتے ہُوئے حالی کا وُہ شعر یاد آتا ہے ؎

مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور بھٹکے ہُوئے دِل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

اس کی آخری کتاب یعنی سوانح عمری میں جو اس کے پسِ مرگ شائع ہُوئی ہے۔ نہائت دلچسپ بات یہی ہے۔ کہ اس نے اپنے حالات اور خیالات بلا کم و کاست لکھ دیئے ہیں اور اپنے نقائص کا بے حجاب اقرار کیا ہے۔ اِس کے ساتھ اس کی خُوبیوں کا گہرا نقش دِل پر بیٹھتا جاتا ہے اور خُوبیاں عیُوب کو بُھلا دیتی ہیں۔ اِس کی اعلیٰ درجے کی دیانتداری۔ بے دھڑک اخلاقی جُرأت۔ مثالیہ کی بلندی۔ بیحد مشکلات کے باوجُود اپنے مثالیہ کو عملی صُورت دینا۔ عادات کی سادگی۔ ابنائے جنس کی صحت کی جُستجو۔ بچّوں کی محبت اور دیرپا دوستیاں قائم کرنے کی قابلیّت ایسی خصلتیں ہیں۔ جن کی تعریف کئے بغیر رہا نہیں جاسکتا اور اِس سوانح عمری کو پڑھنے والا کتاب کو پسند کرتے وقت مصنّف کی حیثیتِ انسانی بھی تعظیم اپنے دل میں پاتا ہے۔ اور اِس بڑے فلسفی کے خیالات سے خواہ اُسے اتّفاق ہو یا نہ ہو۔ اس کو بڑا آدمی تسلیم کرنے میں انکار کی گنجائش نہیں رہتی +

عبدالقادر (از لندن)

انسانی افعال اطاعت

(سلسلے کے لئے جنوری ۱۹۰۵ء کا نمبر ملاحظہ ہو)

آغاز میں پرستش بزرگون کی ہوئی - ترقی کرتے کرتے دیوی دیوتا کی پرستش مین مبدل
ئی - اِس طریق پر کہ جب ایک معمولی شخص کے مرجانے پر اس کی مشٹنے کی ناراضگی سے خائف ہوکر
ں کے لئے غذا و لباس کی فکر شروع ہوئی - یا مُردہ کو کفن پہنانا - اُس کی قبر پر قربانیاں یا غذا
چھوڑ دیا جانا شروع ہوا - تو ایک ایسے شخص کی حالت میں جو زندگی میں بہت زبردست اور
ر ہوتا تھا - اور جس کا دائرہ حکومت وسیع ہوتا تھا - بعد مرگ اُس کے مشٹنے کے عتاب
ضگی سے بھی مقابلتاً زیادہ خائف ہوکر اس کی تعظیم یا رضاجوئی بھی اسی کے مطابق شروع ہوئی -
بجائے اس کے کہ ایک یا دو دفعہ صرف اشیاء مطلوبہ وہاں چھوڑ دی جاویں ہر روز یا اکثر
بره کے نزدیک تحفہ تحائف نذر کئے جانے شروع ہوئے - ساتھ ہی ایک معمولی شخص کی حالت
صرف اس کے متعلقین و پس ماندگان کو خیال حصُولِ خوشنودی ہوتا تھا - کہ بھوکا - پیاسا ہوکر
نگار ہوکر مردے کا مشٹنے اپنے رشتہ داروں کو جن سے اسکو توقع غذا و لباس پہنچانے کی
تی تھی - انکو تکلیف نہ دیوے - ایک مرحوم بادشاہ یا شخص جابر کے مُردے سے بہت سے اشخاص کو
ندگی میں اس زبردست حاکم کی رعایا ہوتے تھے - خوف و ہراس ہونے کی وجہ سے عام طور پر
لف اشخاص کی جانب سے اس کی خاطرداری یعنی اس کی پرستش شروع ہوئی - ڈالی کی شکل
ں تبدیلی واقع ہوئی - اس کا نام بدل دیا گیا - مگر ماہیت او اصل مُدعا یعنے حصُولِ رضامندی وہی رہا
ے مکان کے مقبرے کو مندر یا شوالہ کہنے لگے - غذا کا نام بھینٹ یا نذر یا قربانی یا چڑھاوا
ر پایا - اور متوفی بادشاہ کے مشٹنے کو دیوتا کہنے لگے اور اس کی تانیث دیوی کہلانے لگی -
میں مشٹنے کی نسبت انسانی عقیدہ بدلا تاہم پُرانی رسم و طریق کو قائم رکھ کر اس خیال کو دوسرے

لباس میں دکھلایا گیا - کہ دیوی اور دیوتا - طاقت کا صرف ظہور ہیں - اور ان کی پرستش ایک زینہ ہے جس سے انسان خالق کی پرستش کر سکتا ہے - یہ تو مابعد کے دلائل یا تعبیریں ہوتی ہیں - اصل بات یہ ہے کہ آغاز اس پرستش کا شئے کے عقیدہ سے ہوا - اور ترقی شدہ حالت میں بھی یہ طریق جاری رہا - گو اس وقت مختلف تفسیریں اس خیال کی کی گئیں - اور اس کے ابتدا اور اس کے ارتقا کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا - یہ خیال ترقی شدہ مذاہب میں بھی موجود ہے - چنانچہ انجیل میں جاہوا یعنے بائبل کے خدا کو - گوشت روٹی میوہ اور شراب سے خوش کیا جانا مذکور ہے - حضرت ابراہیم سے جب خدا اس کے خیمے میں مامری کے میدان میں ملاقات کرنے آیا - تو تازہ اور گرما گرم روٹیوں سے اس کی خاطر مدارات کی گئی - اب اگر انسان اس کتاب کو جس میں صریحاً انسان کی گذشتہ ادنیٰ حالت کے وقت کا عقیدہ موجود ہو - یا جس میں خدا کو انسانی خواص والا - اور انسانی جذبات والا مانا گیا ہو - الہامی نہ مانیں - تو اس کا کیا قصور - جس مذہب میں دیوی دیوتا کے - یا کسی طاقت کی پرستش مذکور ہو - یا پرستش کی ہدایت ہو - ہر ایک عام عقل والا انسان اسکو الہامی ماننے میں سخت تامل کریگا - کیا وجہ کہ اس میں حالات عنا کا انسانی ارتقاء ایک گونہ موجود ہے - اصول ارتقاء کے عمل کو سمجھنے والے بخوبی جانتے ہیں - کہ دیوی دیوتا یا کسی طاقت کی پرستش مردے کے شئے کی پرستش کی ایک اعلیٰ صورت ہے -

ملکی حالت کا ذکر کرتے وقت ہم نے یہ بیان کیا تھا کہ قوانین کی پابندی (جو اصل میں تابعداری حاکم ہوتی ہے) کے ساتھ گو بطور فرض نہیں لیکن بطور رواج - پرانی رسم ڈالی تا ہنوز قائم ہے - جس سے صرف بیرونی طور پر اظہار اطاعت مقصود ہوتا ہے - اسی طرح سے دینی قواعد یا مذہبی احکام دربارہ طریق عمل اخلاقی جو اصل مذہب ہے - اور جن کی تعمیل اصل تابعداری خالق کی سمجھی جاسکتی ہے - اس کے ساتھ بعض اوقات بطور فرض - بعض اوقات بطور رسم و رواج - پرانی رسوم یعنی نذر نذرانہ قربانی یا بھیٹ وغیرہ تا ہنوز قائم ہیں - غیر ضروری اصول جن سے صرف خارجی طور پر اظہار اطاعت مقصود ہوتا ہے - گذشتہ ادنیٰ حالت کے بقایا اعتقاد ہیں - شروع میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ

...ندر بنانے۔ تیرتھ یاترا کرنے سے۔ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ اور ایشور راضی ہوجاتا ہے۔ بعد
...جب غیر ضروری اور ضروری مسائل مذہبی میں تمیز ہوجاتی ہے۔ اور نیک افعال کا کرنا ہی حصولِ
...شنودی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ تو مندر مسجد بنانے۔ حج کرنے۔ تیرتھ یاترا کرنے کے طریق
...اگر حصولِ خوشنودیِ خدا کے خیال سے نہیں۔ تو کسی اور وجہ معقول پر جاری رکھا جاتا ہے۔ جس
...سے کہ ملکی حالت میں بادشاہ کا نذر نذرانہ غیر لازمی سے لازمی بن گئے۔ اور آخر میں ذاتی منفعت
...ے حصول کا خیال جاتا رہا اور یہ رسوم صرف بیرونی علامات متابعت رہ گئیں۔ اسی طرح سے شروع
...ں گو حاکمِ غائب اور طاقتِ اعلیٰ کو تحفہ تحائف قربانیاں ذاتی منفعت کے خیال سے دی جاتی
...ری ہوئیں۔ لیکن آخر میں لازمی ہوکر صرف خارجی نشانِ اطاعت کی حیثیت میں قائم رہیں۔ اور
...ں طرح سے کہ ملکی حاکم اور اس کی ماتحت حکام کے تحفے وغیرہ ٹکس۔ اور معاوضہ وگذران میں تبدیل
...و گئے۔ اس طریق سے افراد کی آمدنی کا کچھ حصہ مندروں اور گرجوں کے برہمنوں اور پادریوں
...حق سمجھا گیا جنکے اختیار میں لوگوں کے عقاید کے مطابق فواید آسمانی کی تقسیم تھی۔ ان کو تحفہ تحائف
...یئے جانے شروع ہوئے اور آخر میں یہی انکے ذریعۂ معاش بن گئے۔ مندروں کے چڑھاوے
...جاریوں کا وسیلۂ آمدنی متصور کیئے گئے۔ اور عموماً اور بہت سی رسومات مثلاً برت۔ کتھا
...یرہ کا آغاز ہوگیا۔ جن کے ادا کرنے میں تحفہ یا عوضانہ کا دینا رواج پاکر ایک مستقل ٹکس یا خراج
...ہمنوں اور پجاریوں کے حق میں قائم ہوگیا +

۲۔ سلام

...لکی حاکم کی متابعت کی بیرونی علامات بطور حرکتِ اعضاء بدنی چار قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک
...رش یعنی عجز و انکسار۔ دوسرے ملاقات۔ سوم غلامانہ حرکات کرنا۔ چہارم نمائشِ افعالِ محبت۔

۱۔ سب سے ادنیٰ حالت اسلام کی کورنش ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں۔ کتا جس کو مکمل اطاعت
...اظہار مطلوب ہو۔ پیٹھ کے بل لیٹ کر پہلو بہ پہلو آہستہ آہستہ لوٹتا ہے۔ اسی طرح سے ادنیٰ حالت

سوسائٹی میں جب ملکی حاکم کا غلبہ از حد زیادہ ہوتا ہے۔ اور مفتوح یا مغلوب کو مکمل اطاعت کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ تو سب سے اوّل پیٹھ کے بل لیٹ اِدھر اُدھر لوٹنا اور زبان سے ساتھ ہی شکریہ اور خوش آمدید کرتے جانے کا رواج ہوتا ہے۔ یہ طریق لونگ سٹون انگریزی سیاح نے افریقہ کی قوم بتوکہ میں بچشمِ خود دیکھا ہے۔ اِس حرکت سے چونکہ مقابلہ و مخالفت کا بالکل ترک کر دینا مقصود ہوتا ہے۔ اِس لئے یہ سب سے مکمل لیکن سب سے ادنیٰ حالت ہوتی ہے۔ اِس کے بعد قریب قریب کی ادنیٰ حالت وُہ ہے کہ بالکل مُنہہ کے بل زمین پر لیٹ جانا۔ اور اپنی گردن پر دُوسرے کو پاؤں رکھنے دینا۔ یہ اب تک بعض افریقہ کی وحشی اقوام میں جاری ہے۔ اِس کے بعد اختصار ہو جاتا ہے۔ اور صرف مُنہہ کے بل زمین پر لمبے لیٹنے پر اکتفا ہوتا ہے۔ جُوں جُوں طاقتِ شاہی کا غلبہ کم ہوتا جاتا ہے۔ بیرونی علامت اطاعت کا اختصار ہوتا جاتا ہے۔ کورنش کی طرز یعنی درجہ وار اختصار اختیارات شاہی کے محدود ہوتے جانے کے ساتھ ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ اور ادنیٰ حالت یعنی مُنہہ کے بل زمین پر لیٹی ہُوئی حالت سے اُوپر اُٹھنے میں جو سلسلہ وار حالتِ بدنی دیکھی جاتی ہے۔ وُہی درجہ بدرجہ سوسائٹی میں مروّج ہو گئی ہے۔ اوّل ہاتھ پاؤں اور زانو اور ماتھا سب زمین پر لگے ہوتے ہیں۔ صرف پیٹ اُوپر کو اُٹھی ہوتی ہے۔ بعد ازاں سر بھی اُٹھا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہاتھ بھی زمین سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ یعنی صرف پاؤں اور دونوں زانو زمین پر لگے ہوتے ہیں۔ کھڑی ہُوئی حالت سے زمین پر مُنہہ کے بل لیٹنے اور مُنہہ کے بل لیٹی ہُوئی حالت سے کھڑی ہُوئی حالت میں ہونے کے درمیانی حالت دو زانو بیٹھنا ہے۔ کورنش کی یہ رسم مُغلیہ بادشاہان کے وقت دربار میں جاری تھی۔ تصاویر میں پُرانے شاہان کے دربار میں وزیر اُمرا دو زانو بیٹھے ہُوئے دکھلائے جاتے ہیں۔ دو زانو کے بعد ایک زانو ہونے کی حالت ہے جو بعض قوموں مثلاً عیسائیوں میں خُدا سے دُعا مانگتے وقت اختیار کی جاتی ہے۔ اِس کے بعد اقامت کی حالت۔ اور پھر ایک زانو کو صرف تھوڑا سا خم دیدینا بطورِ اختصار طریقِ اوّل کے دیکھا جاتا ہے۔ جُوں جُوں زورِ شاہی کم ہو جاتا ہے۔ ضرورت بیرونی علامت کی کم محسوس ہوتی ہے۔ اور سلام کی شکل

میں اَور تبدیلیاں ہوکر - اوّل کمر کو نیچے کی جانب خم دیا جانا اور بعد ازاں فرشی سلام سے کم ہوکر معمولی سر کو نیچے جھکا دینا جاری ہوتا ہے - یہ خم بھی تھوڑا ہو کر رفتہ رفتہ صرف معمولی جنبش سر کی باقی رہ جاتی ہے - جس طرح کہ انگریزوں میں "ناڈ" کا دستور ہے -

۲ - مُلاقات کی رسم شروع میں لازمی نہ تھی - صرف بیرونی علامت متابعت کی تھی جس سے دُوسرے کی خوشنودی - خاص اغراض کی وجہ سے حاصل کی جاتی تھی - بعد میں ڈالی کی طرح یہ رسم بھی پُختہ ہو کر لازمی بنگئی - اور ساتھ ہی بادشاہ کی طاقت مستحکم ہونے پر یہ مصلحت مُلکی ہُوئی کہ ماتحت دربار میں متواتر حاضری دیکر - اظہارِ اطاعت کریں تاکہ ان کا خیال بادشاہ کی جانب معلوم ہوتا رہے - اور مخالفت یا مقابلہ کی تیاری اور آپس میں سازش کا موقعہ انکو کم ملے - مغلیہ بادشاہان کے وقت دربار خاص و دربار عام ہوا کرتے تھے اُمرا، وزرا، کی حاضری دربار میں لازمی ہوا کرتی تھی - اور خاص درجے کے آدمیوں کے لئے فرض تھا کہ دن میں دو بار صبح جسوقت بادشاہ عدالت کرے اور شام کو حاضری دیجایا کریں - جموں و کشمیر میں اب تک یہی دستور ہے - مہاراجہ صاحب دربار کرتے ہیں - ہر ایک شخص کا جو ایک خاص درجے کا ہو - حاضر ہونا رواجی فرض ہے جس کا ادا نہ کرنا باعثِ رنجیدگی خاطر ہوتا ہے - انگلستان میں بھی سابقہ وقتوں میں اس رسم کا بڑا چرچا تھا - اور آجکل بھی شاہی دربار میں اعلٰی عُہدہ داران اور خاص درجے یا حیثیت کے آدمیوں کا جانا ایک رسمِ تعظیمانہ ہے - غیر حاضری کو غیر مؤدبانہ کارروائی سمجھا جاتا ہے - اور بلاوجہ متواتر غیر حاضری سے وفاداری کا معدوم ہونا خیال کیا جاتا ہے -

۳ - متابعت کی تیسری بیرونی علامت غلامانہ حرکات کا دکھلانا ہوتا ہے - شروع میں فاتح - مفتوح کے ہاتھ رسّی سے جکڑ کر یا اس کے گلے میں کچھ چیز ڈالکر انکو سر برہنہ - پا برہنہ - بلکہ تن برہنہ لے آتے تھے - اس کے بعد ہاتھوں کا خود بخود باندھ دینا - یا گلے میں کپڑا ڈالنا - یا برہنہ جانا - یا سر برہنہ ہونا - ایک علامتِ اطاعت و عجز انکساری بن گئے - مثلاً : نمستے - یعنی ہاتھوں کا جوڑ کر ہاتھے پر سامنے رکھنا - دھرم سالوں میں باہر جُوتی اُتار کر جانا - اور اندر گلے

میں پٹہ ڈالکر ہاتھ جوڑ کر اس کپڑے کو آگے سے پکڑ لینا۔ گرجوں میں اور عزت کے موقعوں پر ٹوپی کا اُتارنا وغیرہ یہ موجودہ مثالیں ہیں کہ جن میں غلامانہ طریق کی نمائش نظر آتی ہے۔ جوتی اور چھاتے کے بارے میں بعض حکام کی سختی مذہبی مقامات میں جوتے کے لے جانے کی سخت ممانعت اور چھاتا اُوپر کر کے جانے کو معیوب خیال کرنا۔ ساتھ ہی بعض رسوم مذہبی کے وقت تن برہنہ۔ سر برہنہ۔ یا پابرہنہ ہونا یہ تمام بآسانی سمجھ میں آسکتی ہیں اگر اس امر کو مدنظر رکھا جاوے۔ کہ ان افعال کا آغاز بطورِ نمائش غلامانہ طریق کے ہوا۔ بعد میں اُن کے واسطے بعض موقعوں پر مختلف وجوہ وضع کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ جوتی اندر لے جانے سے فرش میلا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اصل میں یہ افعال نہ کرنا بے ادبی اور گستاخی میں اسی وجہ سے داخل ہوئے کہ اِن کا کرنا شروع میں ادب اور تعظیم کی نشانی تھی۔

آخری شکل سلام کی بطور نمائش افعال محبت کے ہے۔ چونکہ جس شخص کو انسان پسند کرتا ہے۔ اسکو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اُچھلتا ہے کودتا ہے اور اظہار مسرت کے دیگر افعال مثلاً تالی بجانا۔ چومنا۔ نعرے مارنا وغیرہ اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور چونکہ قدرتاً ہر ایک انسان کی طبیعت کو اس سے سرور آجاتا ہے کہ دُوسرا اس کو فی الواقع پسند کرتا ہے۔ یہ کمزوری انسانی دیکھکر نمائش پسندیدگی کا اظہار ملکی حاکم کی طرف کرنا رواج ہو جاتا ہے۔ ظاہری نشانات میں خوشی سے چومنا سب سے اوّل جاری ہوتا ہے۔ لیکن ایسی شکل میں کہ کورنش کی صُورت اِس میں موجود ہو۔ یعنی اظہارِ محبت ہو لیکن اطاعت آمیز۔ اِس لئے دیکھا جاتا ہے کہ سر اور کمر کو خم دیکر بادشاہ کا ہاتھ یا کپڑے کے چومنے کا رواج اکثر ممالک میں جاری ہے۔ یہ تو اعلیٰ درجہ ہے۔ اس سے پیشتر جب طاقتِ ملکی بادشاہ کی زیادہ ہوتی تھی۔ اور اسی قدر خوشامد بھی مطلوب ہوتی تھی۔ تو دُور سے اس جگہ کو چھوا جاتا تھا۔ جہاں بادشاہ کھڑے ہُوں اور بعد ازاں جب غلبہ حاکمِ ملکی کے کم ہو جانے کی وجہ سے اُس کے نزدیک پہنچنے کا حوصلہ لوگوں کو ہُوا۔ تو اس کے پاؤں کو چومنے کی رسم جاری ہوئی۔ یہ رسم اختصار پاکر۔ رواج ہوا کہ زمین کو۔ یا پاؤں کو ہاتھ سے چھولیا۔ اور

پھر اپنے ہاتھ کو چوم لیا۔ گویا اس ٹیڑھے طریق سے چومنا جاری ہو جاتا ہے۔ آجکل پہلوان لوگ اکھاڑے پر
سی طرح کرتے ہیں۔ زمین کو ہاتھ سے چھو کر ہاتھ کو چوم لینا اور پیشانی پر رکھنا۔ یہ طریق کچھ عرصہ
ہوا بادشاہ کے کورنش کا تھا۔ اس کے بعد اور اختصار ہو کر رفتہ رفتہ پاؤں کو ہاتھ لگانا۔ پھر اس کم
م درجہ گھٹنوں کو ہاتھ لگانا۔ پھر اس سے بھی کم ہاتھ کو نیچے کر کے دوسرے کے ہاتھوں کو ہاتھ
لگانا جاری ہوتا ہے۔ جس کی تازہ مثالیں بزرگوں اور رشتہ داروں کی ملاقات کے وقت ایک
چھوٹے کی طرف سے دیکھی جاتی ہیں۔ بزرگوں کے پاؤں کو ہاتھ لگایا جاتا ہے۔ اس سے کم درجہ
قابلِ عزت رشتہ داران کے گھٹنوں کو۔ پھر معمولی رشتہ داروں اور متعلقین کو ملتے وقت صرف
ہاتھوں کو نیچے کر کے۔ ان کے ہاتھوں سے ملایا جاتا ہے۔ بعد میں صرف مصافحہ کی حالت رہ جاتی
ہے۔ یہ مثالیں درجہ وار اختصار کی ہیں۔ علاوہ چومنے کے چند دیگر افعالِ محبت بھی ہیں۔ جو حاکمان
لکی سے محبت آمیز اطاعت کا اظہار کرتے وقت کئے جاتے ہیں۔ مثلاً تالی بجانا۔ نعرے مارنا۔
اچھلنا۔ کودنا وغیرہ۔ یہاں سے ایک مودبانہ رسم قائم ہو جاتی ہے کہ بادشاہ کو دیکھ کر اظہار خوشی و
پسندیدگی کیا جاوے۔ خوش آمدید و مبارکبادی کے ایڈریس دیئے جاتے ہیں۔ آتشبازی چلائی
جاتی ہے۔ جھنڈیاں وغیرہ ادھر ادھر گاڑ کر رونق کر دی جاتی ہے۔ گولے وغیرہ چلا کر۔ چیرز۔
دیگر ایک خوشی کا جو رعایا کے دل میں ہو۔ یا کم از کم نمائش کے طور پر ہی اظہار کیا جاتا ہے۔ مذہب
میں بھی جو سلام کے اشکال ہیں۔ اگرچہ ان کے نام مختلف ہونگے۔ تاہم سب کی حقیقت وہی ہے۔
ڈالی کا ذکر کرتے وقت ہم نے کہا تھا کہ مذہبی خیالات کی تبدیلی میں اول مُردے کے مٹنے کو بعد
ازاں دیوی دیوتا کو۔ اور آخر میں خدا کو طاقتِ اعلیٰ یا حاکمِ غائب سمجھا گیا۔ اس لئے رسم سلام
جب بطورِ ملاقات کے جاری ہوئی۔ تو اولاً بزرگوں یا متوفی حاکموں کی قبر پہ جانا جاری ہوا جس کو
مسلمانوں میں زیارت کرنا کہا گیا۔ پھر جب دیوی دیوتاؤں کا خیال قائم ہو کر مندر وغیرہ قائم
ہوئے۔ تو جس طرح سے ملکی حاکم کے دربار میں حاضری دی جاتی تھی۔ اسی طرح بتکدوں -
مندروں - شوالوں میں جانے کی رسم جاری ہو گئی۔ تیرتھ یاترا کی ایک یہ بھی بنیاد ہوئی۔ بعد ازاں

جب ایشور کا خیال قائم ہوا۔ اور کوئی خاص مقام خدا کی رہائش کا نہ مانا گیا۔ اس وقت بھی مندر وغیرہ یعنی مسجد۔ سماج۔ گرجا کو ہی خانۂ الٰہی سمجھ کر اس جگہ جانے کا رواج ہوا۔ آجکل بھی مذہبی سماجوں دھرم سالوں۔ مندروں۔ گرجوں میں جانا لازمی خیال کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح سے کہ ملاقات حاکمِ ملکی اختیاری سے لازمی ہو کر صرف بیرونی علامتِ متابعت کی رہ گئی تھی۔ اسی طرح سماجوں میں جانا لازمی ہو کر صرف بیرونی علامتِ اطاعت قرار پا گئی ہے۔ جو دھرم سالہ گرجا میں نہ جاوے۔ وہ لامذہب سمجھا جاتا ہے۔ خواہ وہ شخص مندر یا دھرم سال میں باقاعدہ حاضر ہونے والے شخص کی نسبت اخلاقی ہدایات کا زیادہ پابند ہی کیوں نہ ہو۔ قوائے عقلیہ کی ترقی کی وجہ سے اب ظاہری معنوں میں مسجد یا مندر کو خانۂ الٰہی نہیں سمجھا جاتا۔ تاہم یہ درست ہے کہ شروع میں صرف یہی خیال تھا۔ اور پرانی رسم کو جو اس خیال سے پیدا ہوئی۔ قائم رکھ کر مسجد یا مندر کا اب بھی مذہب سے خارجی طور پر خاص تعلق سمجھا جاتا ہے۔

مذہب میں کورنش کے طریق میں بھی بہت سی مختلف حالتیں دیکھی گئی ہیں۔ پہلے مردے کے مثنے۔ بعد ازاں دیوی۔ دیوتا۔ پھر خدا تعالیٰ کی اطاعت کا اس طریق سے اظہار سوسائٹی کی مختلف مذہبی حالتوں میں دیکھا گیا ہے۔ لطف یہ کہ اسی طرح کے درجہ وار اختصار کے ساتھ جس کا ذکر اوپر ہوا۔ جوں جوں اصل اصولِ مذہب ترقی پاتے گئے۔ اخلاقی ہدایات قائم ہو کر خارجی رسومات کی ضرورت کم سمجھی جاتی رہی۔ اور جوں جوں خدا کو کم مطلق العنان مانا گیا۔ اور مستقل قواعد یا قانون مذہبی یعنی اخلاقی ہدایات پر عقیدہ قائم ہوا۔ طریقِ سلام بھی مختصر ہوتا گیا۔ ڈنڈوت کے بعد دو زانو ہو کر زمین پر ماتھا رگڑنا۔ وغیرہ وغیرہ درجہ وار اختصار کی حالتیں پیدا ہوئیں۔ سلام کی تیسری و چوتھی شکلیں غلامانہ طریق کی نمائش اور افعالِ محبت مخلوط بہ افعالِ اطاعت تھیں۔ یہ بھی مذہب میں دیکھی جاتی ہیں۔ ہاتھ جوڑنا۔ پھر ہاتھوں کا قدرے کھول دینا۔ جس طرح مسلمان دُعا مانگنے کے وقت کرتے ہیں۔ گلے میں کپڑے ڈالنا جس طرح دھرم سالوں میں آجکل دیکھا جاتا ہے۔ مقدس مقامات میں جوتی۔ چھاتے کا اتارنا۔ پچھلے قدموں واپس آنا جب تک کہ نظر سے غائب نہ ہوں

لامانہ طریق کی نمائش مذہب یعنی موجود ہونے کی تمثیلیں ہیں۔ مندر کے آستان کو چومنا۔ ڈیوڑھی
دروازے کو چومنا۔ ماتھا رگڑنا۔ یا جہاں بت پرستی جاری ہو۔ وہاں بت کے پاؤں کو چومنا۔
کی اختصار کے ساتھ بت کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر ہاتھ کو چومنا یہ مختلف طریق مذہب میں نمائش
حالِ محبت اطاعت آمیز کے ہیں۔

چونکہ بدن ماتھا زمین پر رگڑنے سے خاک لگ جاتی ہے۔ اس لئے بدن یا سر پر اور پیشانی
خود بخود خاک کا ڈالنا۔ بھبوت ملنا۔ گویا اپنے آپ کو ذلیل بتلا کر ایشور کی عزت و تکریم کی ایک
علامت ہو جاتی ہے۔ بعد ازاں اخیر میں آغازِ رسم کی وجہ کو نظر انداز کر کے یہ رسم جاری رہتی ہے
اس کے معنے کچھ اور بیان کئے جائیں۔

ڈالی کی طرح مذہب کے اصلی اصول قائم ہونے پر مقدم کی بجائے مذہبی رسومات مؤخر ہو گئیں
در رسوم و عقائد مذہبی جو شروع میں اس خیال سے پیدا ہوئے تھے کہ انسانی خواص والی طاقت اعلیٰ
و اس طریق سے خوش کیا جا سکتا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ کمزور ہو گئے۔ لیکن اصل اصولِ مذہبی کے
قائم ہونے کے بعد بھی گذشتہ ادنیٰ حالت کے یہ رسوم و عقائد برابر موجود رہے۔

۳۔ خوشامد

شروع میں اظہار اطاعت اپنے سے کسی چیز کو علیحدہ کرنے اور دوسرے کو دینے سے ہوتا
ہے۔ بعد میں حرکاتِ بدنی سے۔ اس کے بعد صرف اسی پر اکتفا ہو سکتا ہے کہ محض زبانی اظہار
اس امر کا کیا جاوے کہ اعضاء بدنی کو مناسب جنبش دینے پر تیار ہوں۔

انگریزوں میں ٹوپی کا سر سے اتارنا داخلِ تعظیم ہے۔ لیکن جب زیادہ تعظیم مدِ نظر نہیں ہوتی۔
یہاں بطورِ اختصار یہ کافی سمجھا جاتا ہے کہ ٹوپی کے ایک کنارے کو صرف ہاتھ سے چھو دیا جائے۔
اس کے معنے ہوتے ہیں کہ ٹوپی اتارنے پر تیار ہوں۔ بزرگ یا بادشاہ کے سامنے کرسی سے بالکل
علیحدہ ہو کر سیدھا کھڑا ہونا ہوتا ہے۔ لیکن معمولی شخص کے آنے پر صرف بیٹھے بیٹھے کرسی سے ایک پہلو کو

ذرا اُونچا کیا جاتا ہے۔ اور یہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح سے دیگر طریق تعظیم میں اختصار شروع ہو جاتا ہے۔ بجائے پاؤں پر گرنے کے اور ماتھا ٹیکنے کے صرف مُنہ سے ہی کہا جاتا ہو۔ "پاؤں لاگیں"۔ "یا پیری پینے" "یا مُہاراج متھا ٹیکنے ہاں"۔ سوسائٹی میں ڈالی اور سلام کے بعد جب تیسرے درجے یعنی خوشامد زبانی کا رواج ہوتا ہے۔ تو بجائے پاؤں پر گرنے کے۔ یا غلامانہ طریق دکھلانے کے "عاجز"۔ "خاکسار"۔ "غلام"۔ "آپ کے پاؤں کی خاک" وغیرہ الفاظ و فقرے۔ معمولی طریق گفتگو میں مروج ہوتے ہیں۔ دہلی کی طرف جہاں ادب کا خیال زیادہ ہے۔ وہاں ملنے پر ہر شخص مخاطب سے کہا جاتا ہے۔ کہ آپ کا "اسم شریف" اور کہاں سے "تشریف لانا ہوا"۔ اور جواب میں اپنا نام اس طریق پر بتلایا جاتا ہے۔ کہ "اس عاجز کا نام۔ بندہ حقیر۔ پر تقصیر میاں محمد نظیر ہے"۔ اور اگر پُوچھو کہ یہ مکان کس کا ہے۔ تو کہیں گے۔ "اِس غلام کا غریب خانہ" اپنی طرف اشارہ کر کے۔ یا مخاطب کی طرف اشارہ کر کے "حضور کا" یا "آنجناب کا"۔ گویا بطریق مختصر آپ کو وُہ اپنا مالک و آقا ظاہر کر کے اپنی جائداد کو دُوسرے کی مملوکہ بیان کرتا ہے۔ جہاں آزادانہ خیال ہو۔ یا جہاں غلبہ حکومت کم رہا ہو۔ وہاں اس قسم کی شائستگی یا دوسرے الفاظ میں غلامانہ طرز نظر نہیں آتی۔ انگریز سے پُوچھو یہ کوٹھی کس کی ہے۔ تو کہیگا۔ "اِٹ اِز مائی ہوس"۔ یہ میرا گھر ہے۔ یہ کبھی نہ سُنو گے کہ اس غلام کا یا اس عاجز کا۔ پنجابی سے پُوچھو۔ تو یہ بھی نہیں کہ "میرا" بلکہ کہیگا۔ "اساڈا گھر ہے"۔ اس فرق کی وجہ صریحًا وُہ ہے جو مذکور ہوئی کہ ہندوستانیوں نے غلامی بہت دیکھی۔ اب اگرچہ غلامی جاتی رہی ہے۔ لیکن طریق گفتگو باقی ہے۔ یہ اپنی تحقیر کے الفاظ بعد میں بیشک اس نیت سے استعمال کیے جانے شروع ہُوئے۔ تاکہ شخص مخاطب کے مقابلتًا بڑائی کر کے اسکو خوش کیا جاوے۔ لیکن شروع میں یہ الفاظ صرف غلام استعمال کرتے تھے۔ پھر چونکہ غلامانہ طریق کی نمائیش ایک اعلیٰ طریق حصُول خوشنودی کا تھا۔ اِس لئے غلامی جاتے رہنے کے بعد بھی اِس قسم کے الفاظ مستعمل رہے۔ اور داخل شائستگی سمجھے گئے۔ یہانتک کہ حاکم۔ محکوم کو۔ اعلیٰ ادنیٰ کو بھی اسی قسم کے الفاظ سے یاد کرنے لگے۔ "غلاموں کا غلام"۔ "داسوں کا

س" - اور انگریزی میں آپ کا عاجز اور تابعدار غلام" وغیرہ فقرے مروّج ہوئے جو بڑے اپنے
ہوٹے اشخاص کو خط لکھتے ہوئے استعمال کرتے ہیں - سرکاری کاغذات میں کوئی افسر کسی غیر
واکر کوئی تحریر بھیجے - تو نیچے ہوگا۔ آپکا عاجز و تابعدار غلام - مراد یہ نہیں کہ در اصل غلام ہو - یہاں
اد صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ فعل محبت نہیں - بلکہ دوسری قسم کا فعل ہو - جہاں دوستی و رشتہ داری کا
ہار مطلوب نہیں ہوتا - اور نیچ کی چھپی نہیں ہوتی بلکہ سرکاری طور - اس جگہ خط کے بھیجنے اور
یجنے والے میں فاصلہ و دوری مدِ نظر ہوتی ہے - نہ تعلق دوستانہ - یہ صرف فعل اطاعت سمجھا
ھلایا جا سکتا ہے - اور چونکہ خود کو مالک لکھنا قدرے معیوب گنا جاتا ہے - اس لئے یہ الٹا فقرہ
ستعمال ہوتا ہے - جس سے گو اپنے آپ کو غلام اور دوسرے کو مالک کہا جاتا ہے - لیکن مراد ہوتی
ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان مالک اور غلام کا رشتہ ہو - پڑھنے والا خود سمجھ لیتا ہے کہ
لکھنے والا غلام نہیں بلکہ مالک ہو -

ان کلمات یا فقرات کے علاوہ جن سے اپنی تحقیر اور کسرِ نفسی پائی جاوے - براہ راست
کلمات دوسرے کی صفت و ثنا۔ عظمت۔ بڑائی کی خوشامد کے طور پر استعمال ہوتے ہیں - مدعا
رف حصولِ خوشنودی ہوتا ہے - اس براہ راست خوشامدی الفاظ یا کلمات میں بھی سادہ -
پیچیدہ - سیدھی اور ٹیڑھی طرزیں ہوتی ہیں - سادہ خوشامد کی مثالیں ہیں - لفٹنٹ گورنر -
وائسرائے - اور بادشاہ کے لئے - ہز آنر - ہز اکسلنسی - ہز مجسٹی - راجہ مہاراجہ نواب کے لئے
ہز ہائی نس - وغیرہ - ممبران کونسل کے لئے - آنریبل - ممبران پارلیمنٹ کے لئے رائٹ آنریبل -
پادریوں کے لئے ریورنڈ اور بشپ کے لئے رائٹ ورشپ فل لارڈ یعنی قابلِ پرستش مالک -
بادشاہوں کے لئے لفظ "اعظم" - "ذو الجلال" - "سایۂ ایزدی" "حافظ دین" - وغیرہ وغیرہ - یہ بھی جیسا
ڈالی اور سلام شروع میں غیر لازمی سے لازمی بن گئے - رواجی طور پر فرض ہو جاتے ہیں - اور بعض
اوقات قانونی خطاب ہو جاتے ہیں - اب اگر لارڈ کو "مائی لارڈ" "یور لارڈشپ" کرکے نہ لکھو - ہز آنر
آنر" وغیرہ الفاظ استعمال نہ کرو - تو داخلِ گستاخی سمجھا جاتا ہے اور سوسائٹی کے ادب و قواعد

میں داخل ہو جاتا ہے کہ یہ فارم ایڈرس کی ہر وقت پوری کی جاوے۔ اسکو توڑنا گناہ یا جرم نہیں۔ تو سخت نامعیب ضرور ہو جاتا ہے۔ انگریزوں میں لیڈی صاحبان سے گفتگو کرتے وقت اُن کے لباس۔ شکل۔ وغیرہ کی تعریف کرنا۔ ایک فعل شائستہ ہو جاتا ہے۔

پیچیدہ خوشامدی کلمات کی ایک ادنی مثال ہے۔ "اس عاجز کے غریب خانہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے منور کیجئے"۔ اور ایسی مثالیں۔ فیضی اور ابوالفضل وغیرہ کی تحریروں میں بیشمار ملینگی۔ چند مروجہ دیسی مثالیں اس قسم کی فقرات ہیں جو زمیندار حاکموں کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔ "اساڈا رب تُساڈے سوا کون ہے۔ اُوپر خدا ہیٹھ تُسی"۔ "حضور ساڈے مائی باپ ہو"۔ (اوپر خدا نیچے آپ ہمارے ماں باپ ہیں) نائب تحصیلدار کو مخاطب ہوتے وقت اسکو سشن جج بلکہ ہمارا رب آپ کے سوا کون ہے؟ چیف کورٹ کے اختیار والا ظاہر کرینگے۔ مثلاً "خدا دی تھاں تُسی۔ ہر گل دا اختیار رکھدے ہو"۔ "چاہے حجور پھانسی دا حکم دے دیون"۔ (خدا کی جگہ آپ کو ہر بات کا اختیار ہے خواہ حضور پھانسی کا حکم دیدیں) ٹیڑھے طریقے سے خوشامد کی مثالیں ہیں۔ جب کسی نے بہت عمدہ کچھ لکھا یا کہا۔ بول اُٹھو کہ "واہ صاحب واہ"۔ "غضب کر دیا"۔ کمال کر دیا۔ شاعر کی داد دینگے۔ "تو کیا نازک خیال ہے"۔ "کیا باریک بینی ہے"۔ "مکرر فرمائیے"۔ "یہ آپ ہی کا حصہ ہے"۔ یا "آپہیں کا کام ہے"۔ شیخ سعدی صاحب بھی اسی خیال سے فرما گئے۔ کہ بادشاہ اگر دن کو رات کہے۔ تو آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہہ دینا چاہئے کہ "اینک ماہ و پروین"۔ خیالِ شاہی کی تائید ٹیڑھے طریقے سے داخلِ خوشامد ہے۔

مذہب میں بھی مذکورہ بالا ہر ایک قسم کے خوشامدانہ الفاظ جس سے خدا کی بڑائی اور انسان کی تحقیر پائی جاوے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور شروع میں یہ الفاظ اس خیال سے کہ مردہ کے مثل اور دیوی دیوتا کی طرح۔ خدا انسانی خواہشیں و جذبات رکھتا ہے۔ اور خوشامد سنکر راضی ہوگا۔ مستعمل ہونے شروع ہوئے۔ پرارتھنا۔ خوشامد کی ایک مذہبی صورت ہے۔ جسکی بنیاد شروع میں اس عقیدے پر ہوتی ہے کہ "خوشامد سے خدا راضی ہے"۔ اب اگرچہ سوسائٹی کی ترقی کرنے پر اور مذہب میں بھی ساتھ ساتھ ترقی ہونے پر یہ خیال بدلتا جاتا ہے تاہم کسی اور بنا پر اس رسم کو جاری رکھا جاتا ہے +

دیوان چند

سُورج - زمین - چاند

سُورج

یہ شعلہ رو ستارہ تمام عالم کا دل ہے اور اپنی حرکت سے ہر چیز کی زندگی قائم رکھتا ہے۔ ان ام قندیلوں میں سے جو آسمان کے بے انتہا میدانوں میں گردش کرتی ہیں۔ آفتاب کی چمکا چوند ے والی روشنی توجہ کو سب سے پہلے اسیر کرتی ہے۔ لیکن گو اس کی ظاہری جسامت کتنی ہی ی ہو اور اس کی روشنی کیسی ہی نورانی ہو۔ یہ ان لکھو کھا ستاروں میں سے صرف ایک ہے ن کو کہکشان کی ساخت میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر ہمارے لئے یہ ایک نظام کا مرکز ہے لوں کے کُنبے کا سردار یعنی وہ کرے جن کا یہ کسی زمانے میں گہوارہ تھا اور جو اب ہوش نبھال کر ہمیشہ کے لئے اپنے ولی نعمت کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ آفتاب ایک شہنشاہ طرح اپنے چمکیلے تخت پر اپنے فدائیوں کے ہجوم میں بیٹھا ہے۔ اس کی نہ نظر آنیوالی طاقت ن کو آکاس میں قائم رکھتی ہے اور ان کو انکی مقرر شدہ راہ پر چلاتی ہے۔ اس کی برکت سے جگہ زندگی و حرکت کا ظہور ہے۔ اگر اس کی روشنی بجھ جائے تو ہماری زمین پر دوامی رات ا جائے۔ اور اس رات کے آتے ہی تمام جاندار چیزوں کی حیات منقطع ہو جائے کیونکہ رف آفتاب کی ہی شعاعیں ہیں جو ہم کو جلا آور برف کی دوامی چادر سے بچاتی ہیں۔

ہماری زمین یا دیگر سیاروں کے مقابلے میں سُورج کا حجم بہت زیادہ ہے۔ زمین سے درہ لاکھ گنے ہے اور جتنے ستارے اس کے گرد چکر لگاتے ہیں ان سب کو اگر یکجا کیا جائے تو ی ان سب سے سات سو گنا ہے۔

ہیئت دانوں نے صرف سُورج کے حجم کو معلوم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس کے

وزن کا بھی تخمینہ لگانے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب ہُوئے ہیں۔ زمین کے وزن سے مقابلہ کر کے سُورج کے عظیم الشان بوجھ کا پتہ لگایا ہے۔ اگر ہم ایک خدائی ترازو مہیا کر سکیں۔ جس کے ایک پلڑے میں سُورج ہو تو دُوسرے میں اس کا پورا وزن کرنے کے لئے ساڑھے تین لاکھ زمین جیسے کُرے ڈالنے پڑینگے۔

زمین کا مدار نو کروڑ دس لاکھ میل سورج سے دُور ہے۔

بعض ستارے اس فاصلے سے دور اور بعض اس سے کم پر چکر لگاتے ہیں۔ کسی کو آفتاب جلاتا ہے اور کسی کو دوامی جاڑے کے سپُرد کرتا ہے۔ عطارد جو آفتاب کا سب سے نزدیک ہمسایہ ہے اور صرف تین کروڑ ستر لاکھ میل کے فاصلے پر ہے وہ قریبًا قریبًا شعلے کی حالت میں ہے۔ نپٹیون جس کی سطح بلاشبہ تمام برف سے مستور ہے۔ سارے نظام شمسی کے پرلے کنارے پر چکر لگاتا ہے۔ اور آفتاب سے دو ارب چوراسی کروڑ پچاس لاکھ میل ہے اور صرف ۱۶۴ سال میں آفتاب کے گرد ایک چکر لگاتا ہے۔ اِس حساب سے نپٹیون کا سال ہمارے ۱۶۴ سالوں کے برابر ہے۔

گو آفتاب کی چمک دمک بے مثال ہے لیکن ڈھائی سو سال ہُوئے کہ داناؤں نے اس بات کو معلوم کیا کہ اس کی سطح پر بعض سیاہ دھبے بھی ہیں۔ یہ دھبّے گو آفتاب کی سطح کے لحاظ سے بہت چھوٹے ہیں لیکن ہماری زمین کے مقابلے میں بے انتہا وسعت رکھتے ہیں۔

انسانی آنکھ عام طور پر ان دھبّوں کو دیکھنے سے عاری ہے۔ لیکن بعض ان میں سے پچھتر ہزار میل کا قطر رکھتے ہیں (زمین کا قطر آٹھ ہزار میل سے کم ہے) اور اگر ہم یہ فرض کریں کہ یہ دھبّے آفتاب کے جسم میں بطور سُوراخ کے ہیں تو ہماری زمین نہایت آسانی کے ساتھ ان میں غرق ہو سکتی ہے۔

اگرچہ ان دھبوں کے وجود کا ثبوت نہایت آسان ہے لیکن جب عوام الناس پر پہلی دفعہ ان کا موجُود ہونا ظاہر کیا گیا تو بعض عیسائی علماء نے اپنے غلط خیالات کے باعث اِس

ت کو کفر خیال کیا۔ ان کے نزدیک آفتاب جیسا پاک اور نورانی ستارہ بے عیب ہونا چاہیے تھا۔
ان دھبوں کی موجودگی میں کسی کو آجکل شک نہیں۔ لیکن ابھی تک فاضلانِ سائنس اس بات کو
طے نہیں کر سکے کہ ان کی اصلیت کیا ہے۔ بعض ہیئت دانوں کا خیال ہے کہ یہ دھبے آفتاب
ے چمکیلے لفافے میں سوراخ ہیں جن سے ہم کو اُس کے اندرونی حالات ظاہر ہوتے ہیں۔ بعض
یگر سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ سیاہ دھبے دھوئیں کے بادل ہیں جو آفتاب کی جلتی ہوئی آگ
ے اُوپر پھرتے رہتے ہیں۔ لیکن جس باقاعدگی کے ساتھ یہ دھبے ظاہر ہوتے ہیں اُن سے یہ
ان گذرتا ہے کہ یہ صرف بادل نہیں بلکہ سطحِ آفتاب کے جُزو ہیں اور انہیں دھبوں کے باعث
ک اور دلچسپ واقعہ معلوم ہوا ہے اور وُہ آفتاب کی محوری گردش ہے جو کہ پچیس سال میں ایک دفعہ
وتی ہے۔

سُورج کی حرارت اس قدر زیادہ ہے کہ انسان کی تیز سے تیز بھٹیاں اس سے کچھ مقابلہ نہیں
سکتیں۔ لیکن انسان ایسی بلا ہے کہ اُس نے اس گرمی کا بھی اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ ایک
شہور عالم یُوں لکھتا ہے۔ فرض کرو کہ زمین جیسے چودہ لاکھ کرہ ملکر ایک کرہ بنایا جائے۔ اس
و پر سات فرسنگ کی کوئلے کی تہ چڑھائی جائے۔ اگر اس تمام تہ کو ہر ایک دفعہ آگ لگائی جائے
و اس گرمی کے برابر ہوگی جو آفتاب ہر سال اپنے اِردگرد دیتا ہے۔ اگرچہ یہ گرمی جو ہم کو نو کروڑ
رہ لاکھ اٹھائیس ہزار میل کے فاصلے پر جلاتی ہے سمجھ سے باہر ہے لیکن بعض دلیر ہیئت دانوں
نے پانی کے اس حجم کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جس سے یہ تمام بجھ جائے اور وہ اس
یں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

زمین

زمین ایک کُرہ ہے جو قُطبین کی طرف ذرا چپٹا واقع ہوا ہے۔ اس کی دو حرکتیں ہیں۔
ب آفتاب کے گرد جس کا چکر سال بھر میں ختم ہوتا ہے اور دُوسری اپنے محور کے گرد جو قریباً

۲۴ گھنٹے میں تمام ہوتی ہے۔ کوپرنیکس نے سب سے پہلے یہ امر سب پر ظاہر کیا اور گلیلو کی روشن ضمیری نے اس کی تائید کی۔

ہمارے کُرہ کے گرد ایک موٹی تہ ہوا کی ہے جو اس کو نہایت ہی نرم گدیلے کا کام دیتی ہے۔ ہوا کی بلندی لاپلیس کے حساب کے مطابق ۲۰ میل ہے۔ اور گو یہ بظاہر چال ہلکی ہے لیکن ڈاکٹروں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ ہم میں سے ہر ایک کے جسم پر ۴۰۰ من کے قریب دباؤ ڈالتی ہے لیکن یہ بھاری بوجھ ہم کو معلوم نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہ جسم کے اندر اور باہر یکساں ہے۔ اور ستیاروں کے مقابلے میں زمین کچھ ایسی بہت امیر نہیں کیونکہ اس کا صرف ایک چاند ہے حالانکہ بعض اور سیاروں کے دو چار بلکہ آٹھ چاند تک بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن ہمارا ایک ہی چاند اپنی شاندار اور محبت بھری روشنی سے دلوں کو لبھانے کے لئے کافی ہے۔

ہماری زمین ایک قطب کے دوسرے قطب تک جانداروں سے پُر ہے اور زندگی کے کرشمے اس میں نئی نئی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ منطقہ حارہ۔ منطقہ منجمدہ میں۔ ہوا میں۔ زمین میں۔ سمندر کی تہ میں جانور اور پودے بود و باش رکھتے ہیں۔ اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ جب ایک نسل منقطع ہو جاتی ہے تو کوئی اور اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ابھی زمین پر کئی پیدائشوں کا ایک سلسلہ اور آنے والا ہے اور اس وقت تک جاری رہیگا جب کہ ہر ایک چیز ایک ہی تباہی میں ٹوٹ پھوٹ کر مفقود ہو جائیگی۔ درحقیقت زمین اپنی روشنی اور زندگی کے زمانے کے بعد ٹھنڈا ہونے کی کیفیت میں ان تمام حالتوں میں سے گذریگی جو اب چاند کو درپیش ہیں۔ اور کسی دن ضرور بالضرور چاند کی طرح ہماری زمین بھی مُردہ اور ٹھنڈا ستارہ بن جائیگی۔

زمین کی ہر ایک چیز اس بات کی کامل گواہی دیتی ہے کہ اس پر بھی بعینہٖ وہی تبدیلیاں اپنا رنگ جما رہی ہیں جو چاند پر کسی زمانے میں ہو چکی ہیں۔ حساب لگا کر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ سمندر کا (جتنا وہ ابتدا میں تھا) $\frac{1}{5}$ حصہ جذب ہو چکا ہے اور جو باقی ہے وہ بھی بلاشبہ اسی

شدہ حصے کے ساتھ شامل ہوجائیگا اور پانی کے غائب ہونے کی رفتار جُوں جُوں پانی کم ہوگا اور زیادہ ہوگی - زمین کا اُوپر کا چھلکا (جسکو ہم زمین کہتے ہیں) دن بدن موٹا ہوتا جاتا ہے اور یہ آسانی کے ساتھ رُوئے زمین کے تمام سمندروں کے پانی سے پچاس گُنا زیادہ پانی جذب کر سکتا ہے -

اس وقت زمین کی سطح شق ہوجائیگی جس طرح کہ آجکل چاند کی ہے - تمام ہوا ان غاروں میں گھس جائیگی جو اسکی شق ہونے سے پیدا ہونگے اور زندگی تو اس سے بہت عرصہ پہلے ہی ختم ہوجائیگی - لیکن یہ حیرت ناک قہر جس کا نازل ہونا لابدی ہے - بہت عرصے کے بعد ظہور میں آئیگا - کیونکہ سلف کے تجربوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زمین کی حرارت کو صرف پندرہ درجے کم کرنے کے لئے نوّے لاکھ سال درکار ہیں -

چاند

زمین کا یہ اکیلا اور وفادار ساتھی جو کہ ابتدا میں اسی کا ایک علیحدہ شدہ آتشی ٹکڑا تھا - اب زرد ہے اور سرد ہے - جوانی کے ایّام میں نہ یہ گردش تھی نہ یہ صُورت - ان دنوں اس کی ساری سطح پر شعلہائے آتشی کے دریا رواں تھے - لیکن زمین کی کشش نے آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھنڈا کر دیا - شکل گول ہوگئی - رستہ مقرّر ہوگیا اور ہزارہا سال کے گذر جانے سے اُس کا پیچ و تاب بھی کم ہُوا اور چاند نے وُہی زرد نقرئی غمزدہ چہرہ اختیار کیا جس سے ہم واقف ہیں اور یہی وُہ شاندار آئینہ ہے جو ہر رات سُورج کی بکھری ہُوئی شعاعوں کو ہم تک عکس کر کے پہنچاتا ہے -

ستاروں کے دُور دراز فاصلے کے مقابلے میں وُہ فاصلہ جو کہ چاند کو ہم سے جُدا کرتا ہے نہایت ہی خفیف ہے - چاند تو گویا ہمارا ہمسایہ ہے اور صرف آنکھ سے ہی اس کی ظاہری ساخت کی غیر معمُولی خصوصیتیں نظر آسکتی ہیں - لیکن یہ خفیف فاصلہ بھی جب انسانی معیار سے دیکھا جاتا ہے تو کچھ کم نہیں کیونکہ چاند زمین سے دو لاکھ سنتیس ہزار میل دُور ہے - اگر ایک انجن معمولی رفتار

سے جائے تو سال بھر میں پہنچے لیکن برعکس اس کے اگر کوئی بھاری چیز چاند سے زمین کی طرف پھینکی جائے تو وہ صرف تین دن ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ و ۱۳ سیکنڈ میں زمین پر پہنچ جائے۔ چاند کی سطح ہر حصے پر نہایت ناہموار واقع ہوئی ہے لیکن چاند پر ہماری زمین کی طرح پہاڑوں کے سلسلے موجود نہیں۔ اکیلی اکیلی چٹانیں تو بہت کثرت سے ہیں اور چاند کی چھٹائی کے لحاظ سے زمین کی پہاڑوں سے وہ بلند بھی ہیں کیونکہ چاند کی سب سے بلند چوٹی اپنے اردگرد کی وادیوں سے چوبیس ہزار سات سو فیٹ بلند ہے۔ چاند کے بہت سے پہاڑ آتش فشانی کے ذریعے سے نمودار ہوئے ہیں اور بعض جگہ تو اس کی اندرونی آگ نے سطح کو ایسا توڑا ہے کہ کریٹر کے کریٹر ایک دوسرے کے پاس جمع ہیں۔ غالباً بہت کم ستارے آتش فشانیوں سے اس طرح تباہ ہوئے ہونگے جس طرح کہ چاند۔ بعض کریٹروں کا قطر پانچ فرسنگ ہے لیکن ایک کا دس فرسنگ ہے۔ اور ان کا بھی جوش خروش مدت سے بند ہے اور آجکل چاند سچ مچ اور یقیناً ایک مردہ ستارہ ہے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ سیاہ دھبے جو چاند پر نظر آتے ہیں۔ اس کے سمندر ہیں لیکن اب یہ معلوم ہوگیا ہے وہ صرف وسیع میدان ہیں۔

چاند کی چٹانیں اور اس کی شکستہ اور پامال شدہ زمین بالکل ویران ہے۔ اس جگہ کہاں کا ایک پتہ نہیں اگتا اور ایک پھول بھی نہیں کھلتا جب ہوا اور پانی ہی نہ ہو تو زندگی ناممکن ہے اگر کوئی جاندار چیز اس جگہ جائے تو تین طرح کی موت کا فوراً شکار ہے۔ بھوک سے مرے پیاس سے مرے اور دم گھٹنے سے۔ چاند کے ان خوفناک اور سرد ملکوں میں ہر ایک چیز سستی اور سردی میں مدفون ہے۔ نہ کوئی آواز ہے نہ آواز کی گونج۔ نہ آسمان نہ بادل نظر آتے ہیں۔ نہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف اور نہ میدانوں میں سبزہ زار ✤

عبدالعزیز

دو ہفتے سیاحت میں

دو چیزوں کی دلچسپی کو تغیراتِ زمانہ کبھی کم نہیں کر سکتے۔ اوّل سوانح عمری۔ دوم حالاتِ سفر۔ جن ممالک کا سفر اب عام ہو چکا ہے۔ اُن کی سیاحت کے حالات بھی جب کوئی نیا سیّاح انہیں لکھے مزا دے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر نظارے سے ہر طبیعت ایک جُداگانہ نتیجہ نکالتی ہے اور ہر دل میں ایک نیا سلسلۂ خیال چلتا ہے۔ اور ایک دل کے جذبات اور کیفیات دوسروں کے لئے قدرتی دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ مضمون جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ در اصل ایک بیج کی خط و کتابت کا حصّہ ہے۔ جو ہم نے نہایت کوشش سے اپنے ایک معزز دوست سے حاصل کیا ہے جو انگلستان میں مقیم ہیں۔ اِن کے ایک مہربان حال میں براہ برلن اور ویانا قسطنطنیہ گئے اور اپنے سفر کے حالات بہ قیدِ تاریخ اپنے دوست کو لکھتے رہے۔ ہر چند کہ یہ اوراق بغرضِ اشاعت نہیں لکھے گئے۔ ہمیں یہ ایسے دلچسپ معلوم ہوئے کہ ہم نے اشاعت کے لئے مانگ لئے۔ خصوصاً یہ دکھانے کی غرض سے کہ ایک بیدار مغز ہندوستانی کو دو ہفتے میں یورپ دارالخلافہ جرمنی پر سرسری نظر ڈالنے سے کیا خیال آتے ہیں:—

۱۸ - جنوری کو صبح کے ۵ بجے برلن پہنچا۔ خستگی بے انتہا تھی۔ اِس لئے ایک ہوٹل میں چند ھنٹے آرام کیا۔ اِس کے بعد یہ دن اور اس سے اگلا دن برلن شہر کی سیر میں صرف کیا۔ سردی ہایت سخت تھی۔ ندی اور نہر منجمد تھی۔ برلن بہ نسبت لندن اور پیرس کے نہایت صاف اور ا شہر نظر آتا ہے۔ باقی ریلوے اور ٹرام وغیرہ اسی طرز پر ہیں جیسے لندن اور پیرس میں۔ برلن میں ھی طمطراق اور نمائش بہت نظر آئی اور مُلک میں ایک قسم کی قومی ترقی و پیشقدمی کی وح محسوس ہوتی تھی۔

۲۰ - جنوری کو ۹ بجے صبح کو برلن سے جانب ویانا روانہ ہوا اور ۱۰ بجے شب کے

وئنا پہنچا۔ ڈرسڈن تک زمین مسطح تھی۔ اس کے بعد پہاڑی سلسلہ شروع ہوا اور پراگ کے قریب تک چلا گیا۔ اور اس کے بعد وائنا تک پھر مسطح زمین نظر آئی۔ ڈرسڈن سے پراگ تک پہاڑ اور جنگل اور دریا البا کے پیچ و خم کا منظر قابلِ دید تھا۔

۲۱۔ جنوری وائنا کے سیر میں صرف ہوا اور اس شہر میں کیا بلحاظ شہریت وصفائی اور کیا بلحاظ وہاں کے باشندوں کی طرزِ معاشرت وشائستگی کے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ہم یورپ کے درجۂ اول کے ملکوں اور قوموں سے نکل کر دوم درجے کے مُلک و قوم میں آگئے ہیں۔ وائنا پُرانا شہر ہے۔ اور قرونِ متوسطہ کے قدیم گرجے اور یادگاریں یہاں بکثرت ہیں۔ رقبہ اس سلطنت کا یورپ میں دُوسرے درجے پر ہے اور مُلک بلحاظِ آب وہوا اور قدرتی مناظر و جغرافی حالت کے رُوس و جرمن سے بہتر اور فرانس و اطالیہ کے مدِّ مقابل ہے۔ تاہم یہ سلطنت بمقابلہ انگلینڈ۔ رُوس و جرمن و فرانس کے پسماندہ ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ اوّل تو یہ سلطنت دو مختلف مگر متحد مُلکوں اور قوموں کا مجموعہ ہے یعنی آسٹریا اور ہنگری۔ اوّل قوم کی زبان جرمن اور دُوسری قوم کی اس سے مختلف ہے۔ اور ہنگری قوم زیادہ تر منگولین نمونے کی ہے۔ دُوسرے اس ملک کا بادشاہ نہایت ضعیف ہے۔ اور ملک بمقابلہ مغربی یورپ کے علم میں بہت پسماندہ ہے۔ اور عوام النّاس رومن کاتھلک اور جاہل ہیں۔

۲۱۔ جنوری کو شب کے ۱۰ بجے مَیں یہاں سے چلا اور وُہ رات اور ۲۲۔ جنوری کا سارا دن ریل میں گذرا۔ ملک مسطح تھا۔ مگر برف سے بالکل سفید ہو رہا تھا۔ آبادی بہت کم۔ مُسافر اکثر نہایت مفلس اور غلیظ نظر آئے۔ لیکن قوّی اور بہت مضبُوط۔ لباس اور ٹوپی بالکل رُوسی کاسک لوگوں کی سی تھی۔ ۸ بجے رات کو مَیں بلگراد پہنچا۔ کچھ تو خستگی اور کچھ کھانے میں بے احتیاطی اور ریلوے کی سخت کثافت کے باعث طبیعت نہایت خراب رہی۔ یہاں سے مَیں نے استنبول تک سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ تین پونڈ آٹھ شلنگ دیکر لیا۔ آسٹریا کی ریلیں نہایت کثیف اور ریلوے سٹیشن نہایت ادنیٰ درجے کے بغیر ریلوے پلیٹ فارم کے نظر آئے۔ اس سے تو ہمارے ہندوستان کی ریلوے لائن اور سٹیشن بدرجہا بہتر و صاف ہیں۔

۲۲- جنوری کے ۱۰ بجے بلگراد سے جانب استنبول روانہ ہوا۔ بلگراد دریائے ساوے کے کنارے ایک اُونچی پہاڑی پر آباد ہے۔ آب و ہوا نہایت عمدہ مگر روسی اثر و تقلید ہر بات میں نظر آتی تھی۔ فوج و قوم کا لباس بالکل رُوسی اور کتابت بھی رُوسی طرز کی تھی۔ باوجودیکہ یہ ریاست صدیوں تک ترکوں کے زیر حکومت و اثر رہی ہے تاہم یہاں کسی بات میں ترکی اثر کا نام و نشان بھی نظر نہ آیا! رات بیداری میں کٹی اس لئے کہ سیکنڈ کلاس بھرا ہوا تھا۔

۲۳- جنوری کی صبح کو ہم نِش اسٹیشن پر پہنچے۔ یہاں سے ایک لائن سالونیکا کو جاتی ہے جو شاید ۲۵۰ میل کے قریب ہے۔ ۱۰ بجے ہم بلغاریہ کی سرحد میں داخل ہوئے اور ۲۳ جنوری کے سارے دن ہماری ٹرین بلغاریہ کے مُلک میں سے چلی۔ اس ریاست کا رقبہ مع مشرقی رومیلیہ کے ۳۸ ہزار میل مربع ہے۔ اور ترکی عملداری یورپ کا رقبہ قریب ۶۸ ہزار میل ہے۔ یہ ملک تمام پہاڑی ہے اور تمام سرزمین برف سے ڈھنپی اور سفید نظر آتی تھی۔ آبادی قریب ساڑھے تین ملین (۳۵۰۰۰۰۰) ہے۔ لیکن ان لوگوں میں ہر جگہ ایک قومی رُوح و حوصلہ مندی نظر آتی تھی۔ گورنمنٹ کانسٹیٹیوشنل[1] ہے اور ملک میں علم کی اشاعت رُوبترقی نظر آئی۔ حتیٰ کہ ریل کے قریب چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی مدرسے نظر آئے۔ یہاں سے بھی تُرکی اثر کا نام و نشان غائب ہوچکا ہے!

۲۴- جنوری کے ۸ بجے شب کے ہم مصطفےٰ پاشا اسٹیشن پر پہنچے۔ یہاں سے تُرکی سرحد شروع ہوتی ہے۔ یہاں بھی مثل اسٹریا۔ بلگراد۔ بلغاریہ کی سرحد کے اسباب کا معائنہ ہوا اور پاسپورٹ[2] دکھانا پڑا۔ ہندوستان اور یورپ میں تُرکوں کی بابت بہت کچھ سُنا تھا اور دل میں بیقراری تھی کہ اس عجیب قوم کی صُورتیں کیسی ہونگی لیکن چند نمونے جو سب سے پہلے اس مقام پر دیکھنے میں آئے اُن کو دیکھکر تو یہ شعر یاد آیا ؎

بڑا شور سُنتے تھے پہلو میں دل کا ۔۔۔ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

[1] یعنی جس میں شاہی تو ہو مگر خود مختاری نہ ہو۔ بلکہ رعایا کی رائے کو انتظام امور میں دخل ہو۔ [2] پروانۂ راہداری۔ تذکرہ۔

نہ تو صورت اور ڈیل ڈول میں کوئی عجیب بات نظر آئی اور نہ اور کسی بات میں کچھ خصوصیت دیکھی کیرکٹر قریب قریب ویسا ہی ہے جیسے دنیا کے اور مسلمانوں کے۔ مگر ان کے یورپ سے قریب ہونے اور ہنوز صاحبِ حکومت ہونے اور گذشتہ عظیم الشان تاریخ کی وراثت کے باعث اور نیز آب و ہوا کے سبب ایک آن ان میں پائی جاتی ہے۔

۲۴۔ جنوری یوم دوشنبہ ۹ بجے صبح صادق کے ہم استنبول کی شہر پناہ کے قریب ہوئے۔ اور بحر مارمرا کے کنارے کنارے ہماری ٹرین گذری۔ وسط استنبول میں گولڈن ہارن کے کنارے اسٹیشن پر ہم بخیریت اترے۔ اوّل تذکرہ کا معائنہ ہوا۔ ۱۵ منٹ صرف ہوئے۔ اس کے بعد اسباب کا معائنہ گمرگ[1] میں ہوا۔ چند سفری کتابوں کے باعث مشکل پیش آئی۔ کتابیں ضبط ہونے والی تھیں کہ ایک پاس کے آدمی نے مجھ سے کہا کہ کچھ نذر کرو۔ ۲ شلنگ نذر کئے اور پیچھا چھوڑایا اور ہوٹل میتروپول میں جو پیرا میں ہی اترا۔ اس موسم میں یہاں برف باری اور قدرے بارش سے تنگ و کثیف سڑکیں نہایت تکلیف دہ ہیں۔ اور بلحاظ اس شہر کے لاثانی موقع اور خوبصورتی کے و قدیم عظیم الشان و خوشنما عمارات و مساجد کے اور نیز ایک عظیم الشان سلطنت اور اسلام کا دار الخلافہ ہونے کے یہاں کی سڑکیں باعثِ شرم ہیں۔ لیکن نہ صرف سڑکیں اور پبلک مدکس بلکہ تمام صیغے اور محکمے اپنی ظاہری حال سے یہ بتلاتے ہیں کہ انتظامی مشین سخت قابلِ اصلاح ہے۔ یہاں رشوت کا بازار گرم ہے اور ترک باستثناء چند خاص خوبیوں۔ مثل شجاعت و سخاوت و مروّت کے باقی باتوں میں دنیا کے اور مسلمانوں سے بہتر نہیں۔ پرانی پشت کے ترک نہایت شاندار وجیہہ اور خوبصورت ہیں مگر موجودہ نسل کے ترک یہاں بھی معمولی سے نظر آتے ہیں۔

استنبول بلحاظ اپنے لاثانی موقع اور قدرتی مناظر کی خوبصورتی کے دنیا میں ایک بے نظیر شہر ہے۔ دنیا کا کوئی شہر یا کوئی خوبصورت مقام اس کے مقابل نہیں ہو سکتا۔ یہاں کی مساجد

[1] چنگی خانہ ۱۲

ن کے نرالے خوبصورت میسنار۔ عالیشان محل۔ سرو صنوبر کے جنگل جو باسفورس کے ناروں کے پہاڑی ڈھالوں کو ڈھانپے ہُوئے ہیں اور دریا مرمرا باسفورس اور گولڈن ہارن منظر ان تمام باتوں نے اس شہر کو ایسی زینت دے رکھی ہے کہ اگر ساری دُنیا کو اس پر شک ہو تو بجا ہے۔ قلم اور کیمرا[۵۱] دونوں اس کی پوری تصویر کھینچنے سے عاجز ہیں اور یہ لطف صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مُسلمانوں کو اس ایک مقام پر جتنا فخر ہو بجا ہے ور یورپ کو اس پر جتنا رشک ہو زیبا ہے۔

یہ شہر تین حصّوں پر منقسم ہے۔ دو حصّے یُورپی کنارے پر ہیں اور تیسرا ایشیا کی طرف۔ استنبول ایک طرف غلطہ و پیرا گولڈن ہارن کی دُوسری طرف۔ ایشیائی حصّے کو سکوتری کہتے یں۔ غلطہ و پیرا میں یونانی اور یورپین آبادی ہے اور تمام سفارت خانے یہاں ہیں۔ گولڈن ہارن پر دو پُل پُرانی وضع کے ہیں جن پر ہر شخص سے آدھی پینی (ہندوستانی سکّے کا آدھ آنہ) محصول لیا جاتا ہے۔

استنبول مشرقی یورپ اور ایشیا کا ایک بڑا مرکز ہے۔ ایک عجیب مجمُوعہ ساری دُنیا کی قوموں مذہبوں اور زباں کا یہاں نظر آتا ہے۔ ہمارے کُرہ مشرقی کے شمالی حصّو کی قومیں اور جنوبی یورپ کی قومیں اور برّ اعظم ایشیا اور افریقہ کی مختلف اقوام یہاں سب ملی جُلی پھرتی ہیں۔ ایک طرف دلیر تنومند حبشی۔ دُوسری طرف نازک جاپانی اور چینی لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک قابلِ دید منظر ہے۔ اور اس اعتبار سے دُنیا میں سب نرالی جگہ یہ معلوم ہوتی ہے۔

اِس اسلامی سلطنت کے بقا کا راز عساکرِ عثمانیہ ہیں۔ یہ بہادرانِ اسلام بھاری ڈیل ڈول یا ظاہری وردیوں کے طمطراق یا دکھاوے کے سپاہی نہیں۔ لیکن اِن کی سیدھی سادی صورتیں غریبانہ وردی سادہ چلنا پھرنا یہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ سپہگری کے اصلی جوہر ان میں ہیں جو

۵۱ عکسی تصویر کا سامان

انہیں دنیا میں لاثانی سپاہی بناتے ہیں اور جب تک کہ ایک ایک اُن میں سے صفحۂ دُنیا سے نیست نہو جاوے یہ پیچھے نہ ہٹیں گے۔ کاش اِن کے افسر بھی ان کے لائق کے ہوتے! اصلی فوج یہ ہے باقی سب تماشا ہے!

یہ بات مجھے یہاں آکر معلوم ہوئی کہ تُرک محض سپاہی قوم ہے اور انتظام میں یا تو اِنکی طبیعت ہی نہیں لڑتی یا اب مادہ نہیں رہا۔ اِس کی کمی ہر طرف محسوس ہو رہی ہے۔ انگریز انتظام کے سلیقے میں یورپ کی تمام اقوام سے بہتر ہیں مگر وُہ جنگی قوم نہیں۔

تُرکوں پر تعصب کا الزام بالکل کذب ہے۔ مَیں نے دیکھا کہ تُرک عیسائی اقوام یعنے اپنی رعیت یُونانی وارمنی وغیرہ اقوام سے اس قدر مل جُل گئے ہیں اور اُنہوں نے اُن کو اتنی آزادی دے رکھی ہے کہ عجب نہیں کہ چند دن میں مُلک کی ساری دولت اور زمین اور پیشوں پر عیسائی حصہ رعایا کا قبضہ ہو جائے۔ استنبول میں جدھر جائیے ہر قسم کی دوکانیں۔ ریسٹوران[1]۔ حجامی خیاطی۔ بزازی۔ نجاری۔ صرافی۔ بنک۔ غرض آمدنی کے سب پیشے وصیغے یُونانیوں یہُودیوں اور ارمنیوں کے قبضے میں ہیں۔ مُسلمان یا تو فوج میں ملازم ہیں یا سول میں اُمرا کے نوکر چاکر یا خیال! خوفناک حالت ہے اور تُرک اِس سے بالکل غافل ہیں۔ انہیں ہنوز اس عظیم الشان مسئلے کا احساس نہیں ہوا۔ کہ زمانہ اسی کو باقی رکھتا ہے جو مقابلے میں اپنے آپ کو بہترین ثابت کردے۔ اور دُوسروں کو کاٹ چھانٹ کے پھینکتا جاتا ہے۔ تعلیم بہت کم اور ابتدائی ہے اور تُرکوں میں علم کا شوق بھی نظر نہیں آتا۔ دن رات قہوہ خانوں میں کافی چاء پیتے اور تاش وغیرہ کھیلتے ہیں۔ مَیں نے اب تک ایک مُسلمان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی!!! انہیں کے قریب بلغاریہ وسربیا کی چھوٹی سی ریاستیں ہیں جہاں انگلینڈ۔ جرمنی اور مغربی یورپ کے طرز خیال کا پرتو پڑ رہا ہے۔ وہاں کا نسٹیٹوشنل گورنمنٹ ہے اور پریس کو نسبتاً آزادی ہے۔ مگر یہاں یہ سب باتیں مفقود ہیں۔

---

[1] دارالتفریح ۱۲

ان چند باتوں نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا اور جس طرزِ معاشرت نے مسلمانوں میں مخربِ اخلاق اثرات پیدا کیئے وہ ہنوز یہاں پائے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ترک سخت بے چینی میں ہیں اور یورپ ان کے سینے پر بیٹھ کر دانے دلتا ہے۔ لیکن پھر بھی تو اُن میں اپنی اصلاح کی کوشش نہیں۔ اس روسی شکست سے ترکوں پر خدا نے اپنا بڑا فضل کیا ہے۔ کاش کہ یہ اس سے اور بے فکر نہ ہو جاویں۔ بلکہ آئیندہ ترقی کی فکر کریں۔ ترکوں کو صرف شمال کی طرف سے خطرہ ہے باقی استنبول کا فتح ہونا کسی اور طرف سے ناممکنات سے ہے۔ قدرتی ڈیفنس ایسے ہیں کہ استنبول تک کسی بحری قوت کا پہنچنا اس زمانے میں ناممکن ہے۔ البتہ اگر آئیندہ جنگ کی کوئی صورت زمین سے اوپر معلق ہوا میں غباروں کے ذریعے سے ہو تو شاید ممکن ہو۔ سلطان نے چند کام اچھے کیئے ہیں۔ ایک تو استنبول کے گریک ارمنی و یورپین اثراتِ بد سے اپنی مسلمان عورتوں کی خوب حفاظت کی ہے کہ اس وقت ایک مسلمان عورت فاحشہ کا وجود بالاعلان یہاں نہیں باقی عیسائی و یورپین قوموں کو پوری آزادی ہے۔ مسلمان عورتیں برقعے کے ساتھ باہر جاتی ہیں اور ٹرام وے۔ اسٹیشن ریلوے وغیرہ پر ان کے لئے علیحدہ کمرے و نشست خلوت کے مقامات ہیں۔ لباس اندر یورپین مگر اوپر ایک سیاہ چادر سے بالکل ڈھنپا ہوا رہتا ہے۔ انکو ہر طرح پر خاصی آزادی حاصل ہے اور یہ اپنے مردوں کی سچی رفیق ہیں۔

استنبول - ۲۷- جنوری شام

آج میں یلدز کوشک کی طرف رسم سلاملق دیکھنے گیا۔ یہ نظارہ قابل دید ہے۔ اس محل کا موقع اور صورت حیدر آباد دکن کے فلک نما سے مشابہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس کے سامنے اور اطراف کا منظر لاثانی ہے۔ ۱۱ بجے ہر چہار طرف سے پلٹنیں رسالے حمیدیہ مارچ کے بینڈ کے ساتھ جمع ہونا شروع ہوئے۔ یہ حمیدیہ مارچ وجد کی حالت طاری کرتا ہے۔ پلٹنوں کے سبز علم و ہلال کی جھنڈیاں۔ اور بہادر سپاہیوں کے چہرے ایک عجب حالت ہر شخص پر پیدا کرتے تھے۔ دور دور تک سیاہ نظر آتی تھی اور غریب غربا تماشائی اس فوج کے پیچھے بہت دور کھڑے

ہُوئے تھے۔ پاشاؤں جنرلوں کی سُنہری وردیاں عجب بہار دیتی تھیں۔ سُلطان کی سواری نمودار ہُوئی۔ سپاہیوں نے "پادشاہم چوق بشا" کے نعرے مارے۔ حمیدیہ قومی راگ بجا۔ مینارے پر ایک خوش الحان مؤذن نغمے کے ساتھ اذان دے رہا ہے اور جس وقت سُلطان کی سواری آئی۔ اکثر پرانے طرز کے مسلمان درود پڑھنے لگے۔ یہ نظّارہ کبھی فراموش نہ ہوگا۔ اِسی نظّارے سے یورپ کا دل لرزتا تھا۔ مَیں نے دُور سے سُلطان کو دیکھا۔ ناک نہایت خمدار ہے۔ میانہ قد۔ داڑھی بھری ہُوئی اور کھچڑی نما اور رنگ بہت گورا نہیں ہے۔

یہاں مساجد میں جُوتے سے نماز پڑھتے ہیں۔ صرف اُوپر کا حصّہ جو سیاہ ربڑ کا جوتا ہوتا ہے اُتار لیتے ہیں۔ باقی اندر کے لمبے بُوٹ نہیں اُتارتے۔ مذہب برائے نام ہے۔ استنبول میں عیسائی تُرک وارمنی کی شناخت بہت مشکل ہے۔ لباس ایک۔ غذا ایک اور سب ملی جُلے ہیں۔ عیسائی دُور اندیش ہیں۔ مگر تُرکوں میں دُور اندیشی کم ہے اور علم کے شوق کی یہ حالت ہے کہ کسی کے ہاتھ میں اگر کتاب ہو تو سب تعجب سے اس کو دیکھتے ہیں! سُلطان اور اِن کی پارٹی اندر سے پُرانے وضع کے لوگ ہیں۔ مگر باہر سے لباس و معاشرت یورپین ہے۔ نئی پود میں صفات کی وُہ پختگی کہاں۔ تُرکوں سے مَیں ایرانیوں کو دماغی حیثیت سے بہتر خیال کرتا ہُوں۔ اور ایرانی بہت زیادہ اصلاح پذیر ہیں۔ یہ خیال کرنا کہ ترک بلحاظ اپنی موجودہ علمی افلاس و بدنظمی کے کوئی دُوسرا مُلک فتح کر لینگے ناممکن ہے۔ ہاں اگر اپنی رہی سہی میراث کو بچا لیں تو گویا بہت کچھ ہے۔ اِن کی حالت ایک بوسیدہ اور منحطاط پذیر شخص سے مشابہ ہے۔ جس کے حوصلے اور اُمنگیں سب سرد ہیں۔ ان میں اس ملک گیری کی رُوح کا شائبہ بھی نہیں جو انگلینڈ فرانس۔ جرمنی اور رُوس میں ہے۔ وُہ قومی تخیل ڈیڑھ سو برس سے ان میں مفقود ہُو چکا ہے۔ اس قوم کی حالت اس شخص سے مشابہ ہے جو جوانی میں نہایت مضبُوط اور عُمدہ کاٹھی کا ہو لیکن اب عُمر کا ڈھلاؤ اس پر آچلا ہو۔ مگر جوانی کے بدن کی کساوٹ کے نشان اب تک اِس میں پائے جاتے ہوں +

پردیسی سیلانی

قومی زندگی

(سلسلے کے لئے اکتوبر ۱۹۰۴ء کا نمبر ملاحظہ ہو)

سال کی قوموں میں اہل اطالیہ تو غیر فرنگستانی ہیں۔ جاپانیوں کو دیکھو کس حیرت انگیز سرعت سے ترقی کر رہے ہیں۔ ابھی تیس چالیس سال کی بات ہے کہ یہ قوم قریباً مُردہ تھی ۱۸۶۸ء میں جاپان کی پہلی تعلیمی مجلس قائم ہوئی۔ اِس سے چار سال بعد یعنے ۱۸۷۲ء میں جاپان کا پہلا تعلیمی قانون شائع کیا گیا اور شہنشاہ جاپان نے اس کی اشاعت کے موقع پر مندرجہ ذیل الفاظ کہے "ہمارا مدعا یہ ہے کہ اب سے ملک جاپان میں تعلیم اس قدر عام ہو کہ ہمارے جزیرے کے کسی گاؤں میں کوئی خاندان جاہل نہ رہے" غرضکہ ۳۶ سال کے قلیل عرصے میں مشرق اقصیٰ کی اس مستعد قوم نے جو مذہبی لحاظ سے ہندوستان کی شاگرد تھی۔ دنیوی اعتبار سے ممالک مغرب کی تقلید کر کے ترقی کے وہ جوہر دکھائے کہ آج دُنیا کی سب سے زیادہ مہذب اقوام میں شمار ہوتی ہے اور محققینِ مغرب اس کی رفتار ترقی کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔ جاپانیوں کی باریک بین نظر نے اس عظیم الشان انقلاب کی حقیقت کو دیکھ لیا اور وہ راہ اختیار کی جو ان کے قومی بقا کے لئے ضروری تھی۔ افراد کے دِل و دماغ دفعتہً بدل گئے اور تعلیم و اصلاح تمدن نے قوم کی قوم کو اور سے کچھ اور بنا دیا۔ چونکہ ایشیا کی قوموں میں سے جاپان نے رموزِ حیات کو سب سے زیادہ سمجھا ہے۔ اِس واسطے یہ ملک دُنیوی اعتبار سے ہمارے لئے سب سے اچھا نمونہ ہے ہمیں لازم ہے کہ اس قوم کے فوری تغیر کے اسباب پر غور کریں اور جہاں تک ہمارے مُلکی حالات کے رُو سے ممکن و مناسب ہو اس جزیرے کے تقلید سے فائدہ اُٹھائیں۔

ان واقعات کی روشنی میں اگر ہندوستان کی حالت کو دیکھا جائے تو ایک مایوس کر دینے والا نظارہ سامنے آتا ہے۔ کیا ہمارا مُلک اپنے پاؤں پر کھڑا ہے؟ اپنے مکان کے اسباب آرائش کر

ہی دیکھو تو معلوم ہو جائیگا کہ ذرا ذراسی بات کے لئے ہم اقوام غیر کے محتاج ہیں اور روز بروز ہوتے جاتے ہیں۔ آپ کا لمپ جرمن میں بنا ہے اُس کی چمنی اسٹریلیا میں تیار ہوئی ہے اس کا تیل روس سے آیا ہے اور گندھک کی سلائی جس سے یہ لمپ روشن کیا جاتا ہے سویڈن یا جاپان سے پہنچی ہے کلاک جو آپ کی نشستگاہ کی دیوار پر آویزاں ہے امریکہ کے کارخانوں میں تیار ہوا تھا اور وُہ چھوٹی سی گھڑی جو آپ کی جیب میں ٹک ٹک کر رہی ہے جینوا کے کاریگروں کی صنعت کا نمونہ ہے۔ علیٰ ہذالقیاس پہننے کا کپڑا ہاتھوں کی چھڑی چاقو قینچی دروازوں کی چلمنیں اور روزمرہ کے استعمال کی صدہا چیزیں غیر ملکوں کے کارخانوں میں تیار ہو کر آپ کے پاس پہنچی ہیں ایسے حالات میں جب مصنوعات و تجارت کی طرف سے ہمارا ملک بالکل غافل ہو یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم مصاف زندگی میں جسکا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے کامیاب ہونگے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے ملک سے کپاس چاء کوئلہ اور مصالح خام کی اَور صورتیں ممالک غیر کو جاتی ہیں مگر غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ بدقسمت ہے وُہ ملک جو ممالک غیر کے لئے مصالح خام کا ایک ذخیرہ ہو اور مصنوعات کے لئے ان کا محتاج ہو۔ وُہ ملک جس کا دارومدار محض زراعت پر ہو جیسا کہ ہندوستان کا ہے نہ ترقی کی دوڑ میں کامیاب ہو سکتا ہے نہ قحطوں اور وباؤں سے نجات پا سکتا ہے جب تک کہ وُہ اپنی آبادی کے ضروریات کو پورا کرنے کی کوئی اَور راہ نہ اختیار کرے۔ جب تک ہندوستان صنعتی ملک نہ ہوگا اور ہم جاپانیوں کی طرح اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہونگے اس وقت تک قدرت ہمیں قحط کے تازیانے لگاتی رہیگی طرح طرح کی وبائیں ہمیں ستاتی رہینگی۔ جس سے ہم جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے ضعیف و ناتوان ہوتے جائینگے۔ اقوام ہند میں سے ہمارے ہندو بھائیوں نے اس راز کو کسی قدر سمجھا ہے اور چونکہ یہ لوگ بالطبع اس کام کے لئے موزوں بھی ہیں اس واسطے یقیناً ان کے سامنے ترقی کا ایک وسیع میدان ہے۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ اگر اس اعتبار سے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو ان کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی صنعت کھو بیٹھی۔ تجارت کھو بیٹھی اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار

سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔ اور باتیں تو خیر ابھی تک اُنکی مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔ آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھکر باقی تمام نوع انسان کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔ غرضکہ ان فرقہ آرائیوں نے خیرالامم کی جمعیت کو کچھ ایسی بُری طرح منتشر کر دیا ہے کہ اتحاد و یگانگت کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی۔

مولوی صاحبان کی یہ حالت ہو کہ اگر کسی شہر میں اتفاق سے دو جمع ہو جائیں تو حیات مسیح یا آیاتِ ناسخ و منسوخ پر بحث کرنے کے لئے باہمی نامہ و پیام ہوتے ہیں اور اگر بحث چھڑ جائے اور بالعموم چھڑ جاتی ہو تو ایسی جوتیوں میں دال بٹتی ہے کہ خُدا کی پناہ۔ پُرانا علم و فضل جو علمائے اسلام کا خاصہ تھا نام کو بھی نہیں ہاں مُسلمان کافروں کی ایک فہرست ہو کہ اپنے دستِ خاص سے اس میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ امرا کی عشرت پسندی کی داستان سب سے نرالی ہو۔ پیر سے چار لڑکیاں اور دو لڑکے تو پہلے ہیں ابھی میاں تیسری بیوی کی تلاش میں ہیں اور پہلی دو بیویوں سے پوشیدہ کہیں کہیں پیغام بھیجتے رہتے ہیں۔ کبھی گھر کی جُوتی بیزار سے فرصت ہوئی تو بازار کی کسی حُسن فروش نازنین سے بھی گھڑی بھر کے لئے آنکھیں لڑا آئے۔ اوّل تو کسی کو جرأت نہیں کہ حضرت کو نصیحت کرے اور اگر کسی کو لب کشائی کا حوصلہ ہو بھی تو چین بجبیں ہو کر ارشاد فرماتے ہیں" تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"۔ عوام کی تو کچھ نہ پُوچھئے کوئی اپنی عمر کا اندوختہ بچے کے ختنے پر اُڑا رہا ہے۔ کوئی سیلے اُستاد کے خوف سے اپنے نازپروردہ لڑکے کا پڑھنا لکھنا چھڑوا رہا ہے کوئی دن بھر کی کمائی شام کو اُڑاتا ہے اور کل کا اللہ مالک ہے کہکر اپنے دِل کو تسکین دیتا ہے۔ کہیں ایک معمولی بات پر مقدمہ بازیاں ہو رہی ہیں کہیں جائداد کے جھگڑوں سے جائدادیں فنا ہو رہی ہے غرض کس کس کی شکایت کریں لنکا میں جو جاتا ہے باون ہی گز کا ہے۔ تمدن کی یہ صورت کہ لڑکیاں ناتعلیم یافتہ نوجوان جاہل روزگار ان کو نہیں ملتا۔ صنعت سے یہ گھبراتے ہیں۔ حرفت کو یہ عار سمجھتے ہیں۔ مقدماتِ نکاح کی تعداد ان میں روز بروز بڑھ رہی ہے۔ جُرم کی مقدار ان میں روز افزوں ہے۔ دماغ شاہجہانی

آمدنیاں قلیل اور افلاس کا یہ عالم کہ "رمضان خوب مہینا ہے مسلمانوں کا"۔ یہ وقت بڑا نازک وقت ہے اور سوائے اس کے کہ تمام قوم متفقہ طور پر اپنے دل و دماغ کو اصلاح کی طرف متوجہ نہ کرے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دُنیا میں کوئی بڑا کام سعی بلیغ کے بغیر نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وُہ قوم اپنی حالت خود نہ بدلے۔ ایک فرنگستانی مصنف لکھتا ہے کہ دیانتداری سے محنت کرنا۔ سب سے بڑی عبادت ہے خواہ اس محنت کا اثر کسی فردِ خاص کی ذات تک محدُود ہو خواہ تمام قوم پر اسکا اثر پڑتا ہو۔ لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو فرد کا وجود قوم کے وجُود کے بغیر تصور میں بھی نہیں آسکتا اور فرد کی کوئی ایسی حرکت نہیں جسکا اثر تمام قوم پر نہ پڑتا ہو۔ ایسی صوُرت میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہر فرد کی محنت حقیقت میں ایک قومی کام ہے۔ اگر اس محنت کا مُدعا مذموم ہوگا تو قوم پر بُرا اثر پڑیگا۔ اور اگر نیک ہوگا تو قوم پر اچھا اثر پڑیگا۔ پس فرد قوم کا پہلا فرض یہ ہے کہ وُہ دیانتداری کے ساتھ اس تمدنی مقصد کو پُورا کرے جو قوم نے اس کے ذمّے دے رکھا ہے اور اس بات کو سمجھ جائے کہ اس کا عروج و زوال حقیقت میں قوم کا عروج و زوال ہے۔ یہی ہے وُہ محنت جس کا نام عبادت رکھا گیا ہے اور جسکی نسبت ایک فارسی شاعر کہتا ہے:۔

اشکِ من خونِ جگر خوردو دویدن آموخت   جُز بہ محنت نشود پا بہ رہِ عشق رواں

دُنیا میں کسی قوم کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس قوم کے افراد اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ نہ کریں کیونکہ جیسا میں نے ابھی کہا ہے فرد کے تمام افعال و حرکات حقیقت میں قومی افعال و حرکات ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کی زندگی بھی اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ قوم کی ملکیت ہے۔ خودکشی کیوں جرم قرار دی گئی ہے؟ بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خودکشی کا اقدام کرنے والے کو سزا دینا ظلم ہے مگر یہ ایک سطحی خیال ہے۔ قانون نے اس بات کو اصولاً تسلیم کر لیا ہے کہ فرد کی زندگی حقیقت میں قوم کی زندگی ہے اور خودکشی کرنے والا اپنی جان پر ظلم نہیں کرتا بلکہ حقیقت میں اس تمدنی قوت کو معدوم کرنا چاہتا ہے۔ جس کا وُہ بحیثیت فرد قوم ہونے کے ایک مظہر ہے۔

اگر ہم جاپان کی تاریخ سے فائدہ اُٹھانا چاہیں اور موجودہ وقت میں یہی ملک ہمارے واسطے بہترین نمونہ ہے تو اس وقت ہمیں دو چیزوں کی سخت ضرورت ہے۔ یعنی اصلاح تمدن اور تعلیم عام۔ مسلمانوں میں اصلاح تمدن کا سوال درحقیقت ایک مذہبی سوال ہے کیونکہ اسلامی تمدن اصل میں مذہب اسلام کی عملی صورت کا نام ہے اور ہماری تمدنی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اصولِ مذہب سے جدا ہو سکتا ہو۔ میرا یہ منصب نہیں کہ میں اس اہم مسئلے پر مذہبی اعتبار سے گفتگو کروں تاہم میں اس قدر کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ حالاتِ زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آجانے کی وجہ سے بعض ایسی تمدنی ضروریات پیدا ہو گئی ہیں کہ فقہا کے استدلالات جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعتِ اسلامی کہا جاتا ہے ایک نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ میرا یہ عندیہ نہیں کہ مسلمات مذہب میں کوئی اندرونی نقص ہے۔ جس کے سبب سے وہ ہماری موجودہ تمدنی ضروریات پر حاوی نہیں ہیں۔ بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصول کی بنا پر جو جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً کیے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لئے واقعی مناسب اور قابلِ عمل تھے مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں۔ اگرچہ شیعہ مفسروں نے بعض بعض اصول کی تشریح میں ایک حیرت ناک وسعت نظر سے کام لیا ہے تاہم جہاں تک میرا علم ہے شریعتِ اسلامی کی جو توضیح جناب ابوحنیفہؒ نے کی ہے ویسی کسی اسلامی مفسر نے آج تک نہیں کی۔ اگر مذہب اسلام کے رُو سے مجسموں کے ذریعے بڑے بڑے علماء اور حکماء کی یادگاریں قائم رکھنے کا دستور جائز ہوتا تو یہ عظیم الشان فقیہہ اس عزت کا سب سے پہلا حق دار تھا۔ دینی خدمت کے اس حصے یعنے فلسفہ شریعت کی تفسیر و توضیح میں امیر المومنین جناب علی کے بعد جو کچھ اس فلسفی امام نے سکھایا ہے قوم اُسے کبھی فراموش نہیں کریگی۔ لیکن اگر موجودہ حالاتِ زندگی پر غور و فکر کیا جائے تو جس طرح اس وقت ہمیں تائید اصول مذہب کے لئے ایک جدید علمِ کلام کی ضرورت ہے اسی طرح قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لئے ایک بہت بڑے فقیہہ کی ضرورت ہے۔ جس کے قوائے عقلیہ و متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بنا پر قانونِ اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظم

کرسکے بلکہ تخیل کے زور سے اصُول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صُورتوں پر حاوی ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اسلامی دنیا میں اب تک کوئی ایسا عالی دماغ مقنّن پیدا نہیں ہوا اور اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاید ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے کم از کم ایک صدی کی ضرورت ہو۔ یہ بحث بڑی دلچسپ ہی مگر چونکہ قوم ابھی ٹھنڈے دل سے اس قسم کی باتیں سُننے کے عادی نہیں ہے اسواسطے میں اسے مجبوراً نظر انداز کرتا ہوں۔

نیست جرأت بعرضِ حال مرا
گلہ مندم زبے زبانیہا۔ (از نتیجۂ راقم مخلص سودہری)

باوجود اس بات کے میں چند خاص تمدنی ضروریات کی طرف ناظرین کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ ان پر غور کرکے ان سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جائیگی۔ اصلاح تمدن کے ضمن میں سب سے زیادہ نازک مسئلہ حقوقِ نسوان کا ہے جس کے ساتھ چند اور ضروری مسائل مثلاً تعدد ازدواج پردہ تعلیم وغیرہ وابستہ ہیں۔ مغربی عُلما نے حقوق نسوان کے متعلق مذہبِ اسلام پر بعض بعض بڑے بیجا اعتراض کئے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض حقیقت میں مذہبِ اسلام پر نہیں ہیں جیساکہ ان عُلما نے خیال کیا ہے۔ بلکہ ان کی آماجگاہ وہ استدلالات ہیں جو فقہائے اسلام نے کلام الٰہی کے وسیع اصُولوں سے کئے ہیں اور جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہی کہ فردی اجتہادات مذہب کے کوئی ضروری اجزا نہیں ہیں۔ ان تمام اعتراضات کا مقصد و مُدعا یہی ہو کہ اصُول مذہب اسلام کے رُو سے عورتوں کی حیثیت محض غلامانہ ہے لیکن ذرا سوچنے کا مقام ہو کہ جس نبی نے نوع انسانی کے ایک بہت بڑے گروہ یعنے غلاموں کو حقوق کے رُو سے آقاؤں کے مساوی کردیا۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہی نبی نوع انسانی کے ایک نہایت ضروری حصّے کو جسکو اُس نے اپنی تین محبوب ترین اشیا میں شامل کیا ہے۔ غلاموں کی صُورت میں منتقل کردیتا۔ مسلمانوں کا موجودہ طریق عمل زیادہ تر فقہائے قدیم کے ذاتی استدلالات پر مبنی ہے اور اس میں

کچھ شک نہیں کہ استدلالات ترمیم طلب ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان استدلالات میں موجودہ حالات کے رُو سے ترمیم کرنا گناہ ہے بشرطیکہ یہ ترمیم اصولِ مذہب کے مخالف نہو۔ عمومیات کو چھوڑ کر خصوصیات پر نظر کی جائے تو عورتوں کی تعلیم سب سے زیادہ توجہ کی محتاج ہے۔ عورت حقیقت میں تمام تمدن کی جڑ ہے۔ "ماں" اور "بیوی" دو ایسے پیارے لفظ ہیں کہ تمام مذہبی اور تمدنی نیکیاں ان میں مستتر ہیں۔ اگر ماں کی محبت میں حُبِّ وطن اور حُبِّ قوم پوشیدہ ہے۔ جس میں سے تمام تمدنی نیکیاں بطور نتیجے کے پیدا ہوتی ہیں تو بیوی کی محبت اس سوز کا آغاز ہے جس کو عشق الٰہی کہتے ہیں۔ پس ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فردِ واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دُنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہل مطلق رہ جائے۔ لیکن اس ضمن میں ایک غور طلب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مشرقی عورتوں کو مغربی طریق کے مطابق تعلیم دی جائے یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے۔ جس سے ان کے وُہ شریفانہ اطوار جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص ہیں قائم رہیں۔ مَیں نے اس سوال پر غور و فکر کیا ہے مگر چونکہ اب تک کسی قابلِ عمل نتیجے پر نہیں پہنچا اس واسطے فی الحال مَیں اس بارے مَیں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

تعددِ ازواج کا دستور بھی اصلاح طلب ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کا جائز قرار دیا جانا ایک دقیق رُوحانی وجہ پر مبنی تھا اور علاوہ اس کے ابتدائی اسلام میں اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے اس کی ضرورت بھی تھی۔ مگر جہاں تک مَیں سمجھتا ہُوں موجودہ مسلمانوں کو فی الحال اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ موجودہ حالت میں اس پر زور دینا قوم کے اقتصادی حالات سے غافل رہنا ہے۔ اور اُمرائے قوم کے ہاتھ میں زنا کا ایک شرعی بہانہ دینا ہے۔

عورتوں کے حقوق کے ضمن میں پردے کا سوال بھی غور طلب ہے کیونکہ کچھ عرصے سے اس پر بڑی بحث ہو رہی ہے۔ بعض مسلمان جو مغربی تہذیب سے بہت متاثر ہو گئے ہیں اس

دستور کے سخت مخالف ہیں۔ اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں اور نیز حال کے دیگر اسلامی ممالک میں پردے کی یہ صورت نہیں ہے جو آج کل ہندوستان میں ہے۔ لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں پردے پر سخت زور دیا جانا اخلاقی وجوہ پر مبنی تھا۔ چونکہ اقوام ہندوستان نے اخلاقی لحاظ سے کچھ بہت ترقی نہیں کی۔ اس واسطے اس دستور کو یک قلم موقوف کر دینا میری رائے میں قوم کے لئے نہایت مضر ہوگا۔ ہاں اگر قوم کی اخلاقی حالت پھر ایسی ہو جائے جیسی کہ ابتدائے زمانۂ اسلام میں تھی۔ تو اس کے زور کو بہت کم کیا جا سکتا ہے اور قوم کی عورتوں کو آزادی سے افرادِ قوم کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے کی عام اجازت ہو سکتی ہے۔

ان تمام اصلاحوں کے علاوہ شادی کی بعض قبیح رسوم قوم کی توجہ کی محتاج ہیں۔ نارضامندی کی شادیاں مسلمانوں میں عام ہو رہی ہیں۔ جن کی وجہ سے ۹۹ فی صدی اسلامی گھروں میں اس بات کا رونا رہتا ہے کہ میاں بیوی کی آپس میں نہیں بنتی۔ منگنی کا دستور نہایت مفید ہو سکتا ہے بشرطیکہ شادی سے پہلے میاں بیوی کو اپنے بزرگوں کے سامنے ملنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کی عادات اور مزاج کا مطالعہ کر سکیں اور اگر ان کے مذاق تدریجاً مختلف واقع ہوئے ہیں۔ تو منگنی کا معاہدہ فریقین کی خواہش سے ٹوٹ سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ موجودہ دستور کے مطابق فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ پر پورا عمل نہیں ہو سکتا۔ لڑکا خواہ منگنی سے پہلے اپنے سسرال کے گھر میں جاتا ہو منگنی کے بعد تو اس کو اس گھر سے ایسی ہی پرہیز کرنی ہوتی ہے۔ جیسے ایک متقی کو میخانے سے۔ افغانوں میں منگنی کے بعد میاں بیوی کو آپس میں ملنے کی عام اجازت ہوتی ہے۔ لیکن یہ غالباً دستور اسلامی نہیں ہے بلکہ اسرائیلی ہے اور پٹھانوں کے اسرائیلی الاصل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس دستور میں بہت سی قباحتیں ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ منگنی کے بعد سے شادی کے زمانے تک بعض مسلمان ذاتوں میں بہت سا روپیہ فضول طور پر خرچ ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے روز کی خانہ جنگیاں اور شکوے شکایت

ہوا کرتے ہیں۔ جن سے جانبین میں ابتدا ہی سے بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے نتائج سے میاں بیوی کی آئندہ زندگی بسا اوقات نہایت تلخ ہو جاتی ہے۔ تاہم اگر اس کی اصلاح کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ دستور نہایت مفید ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں مغربی دستور کورٹ شپ کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور اس کے نقائص معدوم۔ منجملہ اور قومی امراض کے ایک بیجا نام و نمود کی خواہش کا مرض ہے جو عام طور پر ہمارا دامنگیر ہے۔ مجھے اس وقت ایک معنی خیز لطیفہ یاد آیا جسکو بیان کرنے سے رُک نہیں سکتا۔ ہمارے سیالکوٹ کی قریب تحصیل وزیر آباد میں ایک بزرگ کیسر شاہ نام رہا کرتے تھے۔ رندانہ طریق کے ایک صاحب کرامت درویش تھے اور مراقبہ وحدت الوجود سے انہیں خصوصیت تھی۔ قرب و جوار کے تمام معززین ہندو اور مسلمان ان کے حلقہ مریدان میں شامل تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک دیوان صاحب دیوان کے معتقد تھے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی سے فارغ ہو کر حضرت کی زیارت کو آئے اور آتے ہی اپنے نام و نمود کا نقشہ اُتارنا شروع کیا۔ وہ بزرگ ان کے اخراجات کی طویل فہرست خاموشی سے سُن رہے تھے کہ ایک درویش نے جو سائیں صاحب کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ حضرت کھانا تیار ہے۔ سائیں صاحب نے پوچھا بھائی نری خشک روٹی ہے کہ ساتھ کوئی سالن بھی ہے؟ درویش نے عرض کیا حضرت سالن اس وقت موجود نہیں۔ آپ نے دیوان صاحب سے فرمایا کہ ذرا بازار سے جا کر ایک مولی تو لے آؤ ہمیں یہی سالن کا کام دے جائیگی۔ اتفاقاً دیوان صاحب کے جیب میں اس وقت کوئی پیسہ موجود نہ تھا ذرا کھسیانے ہوئے اور سائیں صاحب کے سامنے جو چند کوڑیاں رکھی تھیں انہیں دیکھ کر بولے حضرت یہ کوڑیاں دلائی میرے پاس اسوقت کچھ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹے کی شادی پر جو نام و نمود تم نے حاصل کیا ہے اسے دے کے ایک مولی لے آؤ۔ دیوان صاحب مسکرائے اور کہنے لگے حضرت بھلا نام و نمود کے عوض میں بھی کوئی کھانے پینے کی چیز ہاتھ آسکتی ہے۔ سائیں صاحب نے اپنے معمولی عارفانہ طریق میں فرمایا کہ بھائی جس نام و نمود کی قیمت ایک مولی بھی نہیں پڑتی۔ اُس کے حصول سے

فایدہ ہی کیا۔ دیوان صاحب نہایت خفیف ہوئے اور آئندہ کے لئے اپنی حرکات سے توبہ کی۔

اِصلاح تمدن کے بعد ہماری دُوسری ضرورت تعلیم علم ہے۔ مُسلمانوں نے بالعموم یہ سمجھا ہے کہ تعلیم کا مقصد و منشا زیادہ تر دماغی تربیت ہو اور جو تعلیمی کام آج تک ہمارے اہل الرائے نے کیا ہے۔ اس کی بنا اِسی خیال پر رہی ہے۔ مگر مَیں نے جہاں تک اس مسئلے پر غور و فکر کیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ تعلیم کا اصل مقصد نوجوانوں میں ایک ایسی قابلیت کا پیدا کرنا ہے جس سے ان میں باحسن وجوہ اپنے تمدّنی فرائض کے ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ میری مراد یہ نہیں کہ جو دماغ قُدرتی طور پر علمی تحقیقات کی اصلی صُورتوں کی طرف میلان رکھتے ہیں اُن کے نمُو کو روک دیا جائے بلکہ میرا مُدعا یہ ہے کہ مجمُوعی حیثیت میں قومی تعلیم کی بُنیاد ان ضرورتوں پر ہونی چاہیئے جو انقلابِ حالات کی وجہ سے پیدا ہُوئی ہوں۔ انگلستان ایک تجارتی قوم ہے نپولین ہمیشہ اس قوم کو دوکانداروں کی قوم کہا کرتا تھا مگر مَیں سمجھتا ہُوں کہ تاریخی لحاظ سے یہ بات نپولین کے زمانے میں اس قدر صحیح نہ تھی جس قدر کہ اب ہے۔ یہ مُلک اپنی خوراک کے چار حصّے اور قریباً قریباً تمام مصالح خام غیر ممالک سے حاصل کرتا ہے اور ہر دو صُورتوں میں قیمت کے عوض غیر ممالک کو اپنی مصنوعات دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ انگلستان ایک بہت بڑی دوکان ہے جس سے تمام دنیا کی قومیں اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کرتی ہیں۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ انگلستان کو زیادہ تر ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو اس کے تجارتی کاروبار کو سرانجام کر سکیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایسے مُلک میں تعلیم کا مُدعا زیادہ تر تجارتی قابلیت پیدا کرنا ہو اور اگر واقعات کے رُو سے دیکھا جائے تو انگلستان نے اپنی قومی تعلیم میں اس بات کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس وقت قومی زندگی کے شرائط میں جو حیرت ناک انقلاب آیا ہے میری رائے میں اس کی سب سے بڑی خصُوصیّت صنعت و تجارت ہے۔ ایشیائی قوموں میں سے جاپانیوں نے سب سے پہلے اس تغیّر کے مفہوم کو سمجھا اور اپنے مُلک کی صنعت کو ترقی دینے میں ایسی سرگرمی سے مصروف ہُوئے کہ آج یہ لوگ دُنیا کی مہذّب اقوام میں شمار ہوتے ہیں اِس امتیاز کی وجہ

یہ نہیں ہے کہ جاپانیوں میں بڑے بڑے فلسفی یا شاعر یا ادیب پیدا ہوئے ہیں - بلکہ جاپانی عظمت کا تمام دارومدار جاپانی صنعت پر ہے -

وہ مصاف زندگی جو آجکل اقوامِ عالم میں شروع ہے اور جس کے نتائج بعض اقوام کی صورت میں یقیناً نہایت خطرناک ہونگے ایک ایسی جنگ ہے جسکو مسلح سپاہیوں کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے سپاہی وہ ہنرمند دستکار ہیں - جو خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے ملک کے کارخانوں میں کام کر رہے ہیں - اس زمانے میں اگر کسی قوم کی قوت کا اندازہ کرنا مطلوب ہو تو اس قوم کی توپوں اور بندوقوں کا معائنہ نہ کرو بلکہ اس کے کارخانوں میں جاؤ اور دیکھو کہ وہ قوم کہاں تک غیر قوموں کی محتاج ہے اور کہاں تک اپنی ضروریات کو اپنی محنت سے حاصل کرتی ہے - ان حالات کو مدنظر رکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو تعلیم کی تمام شاخوں سے زیادہ صنعت کی تعلیم پر زور دینا چاہیئے۔ واقعات کے رو سے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو قوم تعلیم کی اس نہایت ضروری شاخ کی طرف توجہ نہ کریگی وہ یقیناً ذلیل و خوار ہو جائیگی - یہانتک کہ صفحہ ہستی پر اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہیگا - لیکن افسوس ہے کہ مسلمان بالخصوص اس سے غافل ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنی غفلت کا خمیازہ نہ اٹھائیں - میں صنعت و حرفت کو قوم کی سب سے بڑی ضرورت خیال کرتا ہوں اور اگر میرے دل کی پوچھو تو میں سچ کہتا ہوں کہ میری نگاہ میں اس بڑھئی کے ہاتھ جو تیشے کے متواتر استعمال سے کھردرے ہو گئے ہیں ان نرم نرم ہاتھوں کی نسبت بدرجہا خوبصورت اور مفید ہیں جنہوں نے قلم کے سوا کسی اور چیز کا بوجھ کبھی محسوس نہیں کیا اس مضمون کے متعلق تاثرات کا جو ہجوم میرے دل میں ہے میں اسے الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ اور یقیناً ان ٹوٹی پھوٹی سطور سے میرے مافی الضمیر کا پورا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا - ۵

از اشک میرسید کہ در دل چہ خروش است

ایں قطرہ ز دریا چہ خبر داشتہ باشد

اقبال

معشوقہ عرب کی یاد

او نقم[1] کی گھاٹیو! اور او شعوب[2] کی وادیو! اور او ضعاد[3] کے سبزہ زار باغو! تمہارا بُرا ہو۔ اور اَے وُہ ریگستان! جہاں قبیلہ عنس خیمہ زن ہے اور اَے وُہ شہر! جہاں قبیلہ قدم آبادہی میں تمہیں کچھ بھی دوست نہیں رکھتا۔ میرے خدا! اگر کبھی ان مقامات میں تو ابر صبح کو برسنے کا حکم دے تو ننھی ننھی ٹھنڈی بوندوں کے بدلے گرم انگارے ہی برسا۔

ہاں او وادی اُشّی! تو مجھے البتہ محبوب ہے جہاں شام کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اِدھر اُدھر سیر کرتے پھرتے ہیں کیونکہ تو اُن رشک حاتم نوجوانوں کا مسکن ہے۔ جو اپنے قبیلے کی طرف سے دیت[5] و قرض ادا کرتے ہیں اور اُس زمانے میں وُہ حقوقِ مہمانداری ادا کرنے والے ہیں جب پَو پھٹنے کے پہلے نہ برسنے والے رقیق[4] ابر کے شامیانے جھم جھم کرنے والے ریگستانی فرش پر تنے رہتے ہیں اور جب قحط خلقِ خدا پر اپنے دانت تیز کرتا ہے تو وُہ اُس کو دندان شکن جواب دینے والے ہیں اگر صبا رفتار گھوڑوں کی پیٹھوں پر اُنکو دیکھو تو ایسے شہسوار معلوم ہونگے جس کے زبردست اعضا میں نام کو جنبش نہیں۔ اور ان کے تیز دم گھوڑے اپنی سُموں سے پتھریلی زمین میں شعلے بھڑکاتے ہیں۔ اُن کے چولہے راکھوں[7] سے بھرے رہتے ہیں اُن کی پاکدامن بیبیاں اُن کو عزیز رکھتی ہیں۔ جب سردی لمبی ناکوں سے پانی بہا دیتی ہے۔ بدلی برسنے کا نام نہیں لیتی۔ اس وقت یہ اپنے قبیلے کی بیوہ عورتوں اور مساکین پر ابر کرم برساتے ہیں۔

ان نوجوانوں کے وُہ اُونٹ جن پر صرف بہار کے دِنوں سواری کی جاتی ہے اور جو بلند کوہان والے ہیں بڑے ہی بدبخت ہیں کیونکہ عام بخشش کی وجہ سے اپنے بڑے نیز دل والے مالک سے

---

[1] مقام کا نام ہے، [2] مقام کا نام ہے، [3] یمن کا کشمیر ہے ۱۲ [4] عرب اسے علامت قحط سمجھتے ہیں ۱۲ [5] اس مال کو کہتے ہیں جسے قاتل قتل عوض میں ادا کرے ۱۲ [6] علامت قحط اسکو عرب جانتے ہیں ۱۲ [7] کثرت ضیافت کی تعریف

جدا ہمیشہ ہو جاتے ہیں اُن کی کریمۃ النسب اُونٹنیاں چراگاہ نہیں جاتیں۔ کیونکہ کون جانتا تھا کہ اُن کا مہمان کب قدم رنجہ فرمائیگا۔ اُن کے دسترخوان کے پیالے لذیذ کھانوں سے بھرے ہُوئے بالکل تاج پوش معلوم ہوتے ہیں۔

اَے وادی اَشّی! میرے دل میں اب کوئی ہوس باقی نہیں اگر ہے تو یہ ہے کہ کاش میں اپنے منتخب چمکتی تلوار والے دوستوں کے ساتھ جو چھوٹے چھوٹے بال والے قدم باز بپھرنے والے گھوڑوں پر سوار ہوتے جن کی سُموں سے پتھر کے ٹکڑے ایسے اُڑتے جیسے چھُواروں کی گُٹھلی توڑنے والے پتھر سے گٹھلیاں۔ صبح ہی صُبح اَتیلج۔ سمنان میں گذرتا ہوتا۔ اور ان دوستوں پر چادریں نہ ہوتیں بلکہ نبع[2] اور شجم[2] کی شاخوں کی کمانیں زیب دوش ہوتیں اور میرا یہ مختصر سا قافلہ سترم کی گھاٹیوں سے گذرتا ہوا تیرے سبزہ زار باغوں کے گرد خیمہ زن ہوتا اور ہماری چاروں طرف سفر کی وجہ سے دُبلے ہونے والے اُونٹ ہوتے اُس وقت میں تجھ سے پُوچھتا کہ اے وادی اَشّی! اُس رشک فردوس چمن کا کیا حال ہے جس تک زمانے کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ جہاں وُہ پاکدامن لڑکیاں سکونت گزین ہیں جو بالکل گڑیا معلوم ہوتی ہیں جن پر فدا ہونے والے وُہ شریف النسب نوجوان ہیں جو اپنے گھروں میں تو آقا ہیں مگر جب تم اُن کے ساتھ اُن کے کجاووں میں سفر کرو تو تمہارے خادم بنے رہینگے۔ اُنہیں دوشیزہ لڑکیوں میں میری ہرنی رویقہ بھی ہوگی۔

اور پھر میں اپنے غبار آلودہ زلفوں والے دوستوں کے ساتھ سفر کی تکان سے سو جاؤں اور میری پیاری رویقہ مجھے خواب میں نظر آئے۔

ہاں ہاں میرے دونوں دوستو[3]! خاموش۔ خاموش۔ وُہ دیکھو رویقہ دبے پاؤں چلی آرہی ہے کیسی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ حنابستہ اُنگلیاں تو بالکل اُسروع[4] ہی معلوم ہوتی ہیں کمر تو تمہارے سے بھی پتلی ہے دانت تو بالکل گلِ بابونہ ہی ہیں۔ نہیں حباب دریا ہیں۔ نہیں نہیں اولے

---

[1] علامت قحط اسے عرب جانتے ہیں۔ [2] یہ دو درخت ہیں جنکی کمان بڑی مضبوط ہوتی ہے [3] عربوں کی رسم ہے کہ شعر میں دو کو مخاطب کیا کرتے ہیں۔ [4] یہ ایک کیڑہ ہے جو ریگستان میں ہوتا ہے۔ اس کا سر تو سُرخ ہوتا ہے۔ مگر اور بدن سفید۔ عربی شعراء مہندی لگی ہوئی انگلیوں کو اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کیا سچی تشبیہ ہے؟

ہیں۔ قامت نیزہ سا سڈول سیدھا ہے آنکھیں نشیلی ہیں۔ او میری[1] سفید اونٹنی کے ہانکنے والے گاوان صحرائی کی آنکھوں اور اُنکی آنکھوں میں تو ہی بتا کیا فرق ہے؟ جُوڑا بندھے ہُوئے بال چھواروں کے خوشے معلوم ہوتے ہیں۔ ایں! اس وقت اِس نے خمار کیوں نہیں اوڑھا؟ ہاں ہاں سچ تو ہے مجھ سے پردہ ہی کیوں کرنے لگی۔ آ! رویقہ! آ میرے پالان کے پاس بیٹھ جا! اپنے آبِ دہن سے میرا سوزِ دل بجھا ہاں یہ تو بتا تو آئی کیونکر تیری نزاکت تو تجھے پڑوسن کے ہاں بھی نہیں جانے دیتی تھی رویقہ! قسم ہے برسنے والی بدلیوں اور چمکنے والی تاروں کی میں تجھے بُھولا نہیں اور نہ عیش و راحت اور طول عہد نے نجد میں دامن[2] زمین پر کھینچ کے اٹکھیلیاں کر کر کے چلنے کا سماں میری لوحِ دل سے محو کیا اور نہ اپنی دل کی قسمت میں میں نے تیرے سوا کسی اور کو شریک ....

ایں! ایں!! کہاں جاتی ہو؟ اچھا جاتی ہو تو مجھے توشہ لے دینے دو۔[3]

از حماسہ

سید سلیمان

زینوفن اپنے اُستاد حکیم سقراط کی نسبت لکھتا ہے:۔

جب تک بھوک نہ لگتی تھی وہ دسترخوان پر نہ بیٹھتا تھا۔ بھوک بڑھانے کے لئے اچار چٹنی کچھ نہ کھاتا تھا جب تک کھانے میں مزہ آتا تھا نوالہ توڑتا تھا۔ مزہ کم ہوتے ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ جب تک پیاس نہ لگتی کچھ نہیں پیتا تھا کہیں ضیافت میں جاتا تھا۔ تو کیا مجال ہے معمول یا بھوک سے ایک نوالہ زیادہ کھالے۔ یا پیاس سے ایک گھونٹ زیادہ پی جائے۔ اور دل کو بھی یہی نصیحت کیا کرتا تھا کہ جس چیز کے بھوک سے زیادہ کھا جانے کو جی چاہے کبھی نہ کھاتا۔ اور جس شے کے پیاس سے زیادہ پینے کو دل چاہے ہرگز نہ پیتا۔ کیونکہ معدہ بھوک سے زیادہ کھانے اور پیاس سے زیادہ پینے ہی سے بگڑتا ہے۔

---

[1] عربی شعرا ہمیشہ اپنے کلام میں اس کو مخاطب کرتے ہیں ۱۲ [2] دامن زمین پر کھینچ کے چلنا اہلِ عرب کے نزدیک تبختر کی علامت ہے ۱۲ [3] یہ ایک محاورہ ہے جس کو عرب بازدید کے موقع پر بولتے ہیں ۱۲

جنابِ داغ مرحوم

حسرت اور تاسف کا مقام ہے کہ آج ہماری قلم کو اقلیمِ سخن کے ایک بردست اور مقتدر بادشاہ سلف کی ایک قدر یادگار اور خلف کے باعثِ افتخار کی موت کا واقعہ درج مخزن کرنا پڑا۔ یعنی جہاں اُستاد بلبلِ ہند ناظم بنگ دبیر الدولہ نواب فصیح الملک بہادر نواب میرزا خاں صاحب داغ دہلوی بتاریخ ۱۴ فروری ۱۹۰۵ء بمقام حیدرآباد ں۔ عازمِ ملکِ بقا ہوئے اور اپنے ہزاروں شاگردوں اور لاکھوں قدردانوں کو افسوس اور رنج کرنے کے چھوڑ گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ○

مرحوم ۲۵۔ مئی ۱۸۳۱ء مطابق ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ نواب شمس الدین احمد خان م کے فرزند تھے اور آپکا خاندان دہلی مرحوم کے شریف ترین خاندانوں میں سے تھا۔ ابتدائی شعور سے فن شعر سے طبیعت کو لگاؤ ل کو شوق تھا۔ گیارہ بارہ برس کے سن میں آپنے خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق مرحوم کا تلمذ اختیار کیا طبیعت یوماً فیوماً ترقی کی اور اوائل جوانی ہی میں اساتذۂ وقت نے آپ کے کلام کی داد دینی اور آپ کی حوصلہ افزائی شروع ۔ ایام غدر ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے تک آپکی عمر بفکری اور عیش و آرام میں کٹی مگر غدر کی آفت نے جہاں اور شرفا اور اہلِ کمال کو تباہ اور پریشان وہاں آپکو بھی ترکِ وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ غدر کے بعد آپ رامپور کو تشریف لے گئے۔ وہاں عرصہ تک مختلف خدمات پر مامور رہے میدانِ شعر میں کوس اُستادی بجایا۔ گلزارِ داغ۔ آفتابِ داغ اور مثنوی فریادِ داغ ایام قیام رامپور کا نتیجہ ہیں۔

۱۸۸۸ء میں آپ حیدرآباد دکن میں وارد ہوئے تین سال تک دربار دکن میں ملازمت کی امید پر حیدرآباد میں مقیم رہے تین سال بعد آخر کار سرکارِ نظام میں ملازم ہوگئے اور روز بروز ترقی منصب ہوتی گئی۔ اسوقت سے دمِ آخر تک آپ حیدرآباد دکن میں ملازم رہے۔ آپکے ردوں کی طویل فہرست کو حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کے نام نامی کے شمول کی زینت حاصل ہے۔

جب آپکے انتقال کی خبر لاہور میں پہنچی تو ہمارے مکرم دوست پروفیسر محمد اقبال صاحب ایم اے نے جو آپکے ارشد تلامذہ میں سے ہیں آپکی ات کی برجستہ اور فی البدیہہ تاریخ نواب میرزا داغ کہی۔ چنانچہ یہ تاریخ پیسہ اخبار لاہور میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ آئندہ پرچہ میں ہم حضرت غ مرحوم پر پروفیسر اقبال کی ایک نظم اور انکی کلام پر میسرز بیگ صاحب کی ایک تنقید شائع کرینگے۔ اگر اسوقت تک حضرت مرحوم کی تصویر بھی دستیاب ہو گئی تو

نیا شوالہ

سچ کہدوں اَے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بُتوں سے سیکھا
جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے مَیں نے آخر دَیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا - چھوڑے ترے فسانے

کچھ فکر پھُوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا
بوٹوں کو پھُونک ڈالا اِس بس بھری ہوا نے

پتھر کی مُورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آمل کے غیریت کے پردوں کو پھر اُٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دُوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہُوئی ہے مُدت سے جی کی بستی
آ! اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دُنیا کے تیرتھوں سے اُونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسمان سے اس کا کلس ملا دیں

پھر اِک انوپ ایسی سونے کی مُورتی ہو
اس ہردوارِ دل میں لا کر جسے بٹھا دیں

سُندر ہو اس کی صُورت چھب اسکی موہنی ہو
اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں

زُنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنے صنمکدے میں شانِ حرم دکھا دیں

پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اسکا
ہر آتما کو گویا اِک آگ سی لگا دیں

آنکھوں کی ہے جو گنگا لے کے اُس سے پانی
اس دیوتا کے آگے اِک نہر سی بہا دیں

"ہندوستان" لکھدیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھُولے ہُوئے ترانے دُنیا کو پھر سنا دیں

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وُہ میٹھے میٹھے
سارے پُجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

مندر میں ہو بُلانا جس دم پُجاریوں کو
آوازہ اذاں کو ناقوس میں چھپا دیں

اگنی ہے وُہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا

اقبال

رباعیاتِ حسن

لفتِ پنج تن ہمارے جی نے — معمور ہیں نورِ حق سے اپنے سینے
مد۔ حیدر۔ بتول۔ شبر۔ شبیر — ہیں منزلِ واحد کے یہ پانچوں زینے

بیر کی کچھ بات نہ مانی۔ نہ ملے — ہر چند کہا ظلم کے بانی نہ ملے
سلام سے یوں شرک جدا رہتا ہے — جس طرح کہ تیل اور پانی نہ ملے

ے شمر و عمر ظلم و ستم کے بانی — کچھ آلِ نبی کی نہ حقیقت جانی
سبطِ احمد کی تشنہ کامی پہ مگر — پانی بھی ہوا جاتا تھا پانی پانی

یا ڈر ہے اگر روزِ قیامت ہو سیاہ — کیا خوف زیادہ ہیں اگر اپنے گناہ
سن کہ حسن کے بخشوائیں گے ہمیں — سبطین علیہم السلام انشاءاللہ

لب پہ ہمارے نہ رہے نالہ و آہ — کیونکر نہ غم و رنج میں ہو حال تباہ
سن افسوس زندگی پر اپنی — شبیر ہوئے شہید اِنَّا لِلّٰہِ

پھُول کانٹے

یا

گُل و گُلچیں

جب ہو چکے بخوبی تیار پھُول[51] کانٹے[52] — دامن میں بھر کے بیٹھا گلزار[53] پھُول کانٹے
اپنی جگہ پہ دونوں تھے مظہرِ صباحت — تھے ماہرُو کے۔ مژگاں رخسار پھُول کانٹے
تھے زینتِ گلستاں۔ یا داغِ سُنبلستاں — لیکن تھے ذاتِ حق کے اسرار پھُول کانٹے
اپنے بنانے والے کی قدرت عجائب — رگ رگ سے کر رہے تھے اظہار پھُول کانٹے
اشرار کے کرشمے۔ ابرار کے طریقے — دونوں بتا رہے تھے دو چار پھُول کانٹے
اک "مرگ" نام گلچیں داخل ہُوا چمن میں — تکنے لگا وُہ ہر سُو ہر بار پھُول کانٹے
واں دایۂ بہاری۔ اتنے میں یُوں پکاری — حضرت ہمیں نہیں ہیں کچھ بار پھُول کانٹے
پالا ہے مَیں نے ان کو کن کن خرابیوں سے — میرے تو ہیں یہ نور الابصار پھُول کانٹے
جاؤ ہٹو بھی صاحب! کیا ظلم کر رہے ہو؟ — مَیں توڑنے نہ دُونگی زنہار پھُول کانٹے
بولا بچشمِ نم وُہ[54]۔ ہم کیا کریں۔ کہ ہم سے — منگواتی ہے ہماری سرکار پھُول کانٹے
جو نخلِ بندِ ہستی دونوں جہان کا ہے — اُس لایزال کو ہیں درکار پھُول کانٹے
ہم داغ دے گئے ہیں اکثر گلوں کے دِل پہ — ہم لے گئے ہیں چُن کر لبیار پھُول کانٹے
اِس گلشنِ مجازی سے انتقال کر کے — دیکھیں گے اب حقیقی دربار پھُول کانٹے
اک نور[56] میں رہیگا۔ اِک نار[57] میں پڑے گا — رہ جائینگے نہ اصلا بیکار پھُول کانٹے

---

[51] کنایہ از ابرار ۱۲ [52] کنایہ از اشرار ۱۲ [53] دُنیا سے کنایہ ہے ۱۲ [54] وہی مرگ ۱۲ [55] اشارہ بسمت خدائے متعال ۱۲ [56] بہشت ۱۲
[57] دوزخ ۱۲

چلائی ماں کہ ہے ہے اس زندگی میں یارب — دکھلا ئینگے کہاں پھر دیدار۔ پھول کاٹنے!

رو رو کے اُس نے آخر دونو کئے حوالے — لے دے کے چلدیا وہ پاکار پھول کاٹنے

آغوشِ مادری میں دو روز رہ کے طالب

دامِ فنا میں آئے ناچار پھول کاٹنے

(طالب بنارسی از بمبئی)

ٹیپو سُلطان

واقعاتِ تاریخ کو نظم میں ادا کرنا اور اُن پر مورخانہ رائے زنی کچھ آسان کام نہیں ہو۔ سخن ور اُس کی مشکلات سے خوب واقف ہیں۔ اور وُہی مندرجۂ ذیل نظم کی جو ہمارے دوست حافظ محمود صاحب شیرانی۔ منشی فاضل۔ نے لکھی ہے داد دینگے۔ آپ اِندنوں انگلستان میں مقیم ہیں اور انگریزی لٹریچر سے آشنائی پیدا کر رہے ہیں۔ انگریزی میں یہ انداز نظم کا بکثرت موجود ہے۔ لارڈ مکالے کی اُن نظموں سے جن میں اُنہوں نے اہلِ روما کے قدیم جنگ آوروں کی بہادری اور حُبِ وطن کی داد دی ہو کون واقف نہیں۔ افسوس کہ انگلستان کے مصنفین تو دُوسرے ملک کے ناموروں کے کارناموں کی تعریف میں بھی رطب اللسان ہوں اور ہمارے اہلِ ملک کبھی اپنی تاریخ کے ورق اُلٹ کر نہ دیکھیں۔ اگر دیکھیں تو ہندوستان کی تاریخ ازسرتا پا بہادری کی داستانوں سے پُر ہے۔ اِس سے بحث نہیں کہ کون کس فریق کا تھا اور کس سے لڑا۔ مگر اپنی اپنی جگہ ہر ایک کے دست و بازو نے جوانمردی کا حق ادا کیا۔ شیرانی صاحب نے اس نظم میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہو۔ اسی اصول کو مدِنظر رکھ کے کیا ہے۔

ے تحصیل کا پیادہ مراد از ملک الملکوت ۱۲

پورس سکندر سے لڑا - پرتھی راج شہاب الدین غوری سے اور ٹیپو سلطان انگریزوں سے - اس سے بحث نہیں کہ عام ہمدردی سکندر سے ہو یا پورس سے - مسلمانوں کی ہمدردی غوری سے ہو یا پھتورا سے - جنوبی ہندوستان انگریزی سلطنت میں خوش ہے یا ٹیپو سلطان کی حکومت میں ہوتا - جو کوئی بھی ہندوستان کے لئے لڑا ہندوستانی کی نظر میں قابلِ وقعت ہے - اور ہندوستان کے ناموروں کی فہرست میں جگہ پانے کا مستحق - شیرانی صاحب کو ٹیپو سلطان کے بارے میں کئی انگریز مورخوں سے اختلاف ہے - مگر ایسے معاملات میں آزادی رائے کا دخل بجا ہے :-

اے رفتگانِ محفلِ ما   رفتید و لے نہ از دلِ ما

عجائباتِ زمانہ کے اے تماشائی   رہا ہے سیرِ جہاں کا جو تو تمنائی
محیطِ ارض پہ کی تو نے گام فرسائی   قطب سے کی ہے قطب تک کی دشت پیمائی
نظر میں ہے تیری خورشید کا طلوع و غروب
زمیں کے دیکھ کے آیا ہے تو شمال و جنوب

تماشہ گاہ ہے ترا زمین کا محور   بہت کیا ہے خطِ استوا میں تو نے سفر
جو دن کو سایۂ خورشید میں کیا بستر   چلا ہے رات کو تو کہکشاں کے راستے پر
کبھی رہا ہے تو ریڈانڈینز[1] کے بن میں
کبھی قیام کیا بیپوا[2] کے مسکن میں

افق پہ جبکہ عناصر میں ہو صف آرائی   جہاز لائے تباہی میں موجِ دریائی
فضا میں جبکہ چلی ہو سموم صحرائی   غبارِ دشت سے آنکھوں میں تیرگی چھائی
ہر ایک حال میں چلنے سے کام ہے تجھ کو
نہ لطفِ صبح نہ کچھ خوفِ شام ہے تجھ کو

دیارِ ہند میں جب سیر کے لئے آنا   تو اپنے پہلو میں تو اک دلِ حزیں لانا

---

[1] امریکہ کے اصلی باشندے ہیں ۱۲ [2] آسٹریلیا کے اصلی رہنے والے ۱۲

عجائبات میں یاں کی نہ دل کو الجھانا | دکن میں جا کے سرنگا پٹم چلا جانا
کہ جس کی خاک میں سوتا ہے شیر ہندوستاں
زمانہ بھول گیا جس کے ہائے سب احساں

ادب ہو شرط تجھے اس مقام عبرت پر | بہانا اشک تو اس تاجور کی تربت پر
فلک سے لڑنا تو اس نامور کی حسرت پر | ہزار آفریں اس شیر دل کی جرأت پر
کہ جس کے نام سے ڈرتے تھے بچگان فرنگ
جھکا ہے سامنے جس کے بہت نشان فرنگ

زمینِ ہند سے اٹھا نہ کوئی فرزانہ | رہا یہ ملک ہمیشہ مطیعِ بیگانہ
بقدر ظرف جو ملتا کسی کو پیمانہ | دکھاتا کر کے وہ کچھ ہائے وہ ہوئے مستانہ
جہاں نے ختم کیے دور سالہائے دراز
ہوا نہ پیدا پتھورا[1] کا کوئی ہم آواز

وہ جام جس سے کہ مدہوش ہو گیا تھا پور[2] | وہ بادہ جس سے کہ سلطان لودھی[3] تھا مسرور
وہ آگ جس میں سر اجل کے شیر شاہ سور | اسی شراب نے ٹیپو کو بھی کیا مخمور
زمانہ گرچہ مخالف ہی پایا ٹیپو نے
کرے گا کون جو کچھ کر دکھایا ٹیپو نے

سپہر ہند کا وہ اک چمکتا اختر تھا | دکن کی خاک کا اک آبدار گوہر تھا
نصیب ہند تھا اقبال تھا مقدر تھا | نہ کیوں ہو ایسا کہ آخر کو ابنِ حیدر[4] تھا
خیال اس نے کیا کچھ نہ اپنی زحمت کا
قدم قدم پہ رہا دھیان اس وصیت کا

فلک بکامِ تو باشد کہ اہتمام کند | سپہر بادۂ عیشے ترا بجام کند

[1] مہاراجہ پرتھی راج جو ترائن کی لڑائی میں سلطان شہاب الدین غوری سے لڑا تھا۔ [2] یعنی پورس جس نے سکندر کی افواج کا مقابلہ کیا تھا۔

زمانہ خنجرِ کین تو در نیام کند — اگر پدر نتواند پسر تمام کند

تراکہ زور بباز وئے تیغ زن باقی است
بگیر تیغ کہ آں حسرتِ کہن باقی است

نہ ڈھونڈو لطفِ سحر گاہ شامِ ماتم میں — کبھی نہ دیکھو گے ذی حجّہ تم محرّم میں
دکھائے خاک بہار اپنی باغ عالم میں — وُہ پھول جو کہ کھلا ہو خزاں کے موسم میں

کئے خدا نے مقرر ہر ایک کام کے وقت
سحر کا کام ملا اس کو ہائے شام کے وقت

دکھائے اُس نے شجاعت کے خُوب ہی جوہر — اِدھر وہ یکہ و تنہا خُدائی ساری اُدھر
وُہ کیا کرے نہ ہو جس کا کہ آسماں یاور — شکست و فتح تو ہے منحصر مقدر پر

نہ ہارا حوصلہ اس تیغ زن نے خوب کیا
مقابلہ تو مرے پہلواں نے خوب کیا

نظام دیکھ کے انداز جنگ ہیں مسرور — پھرا ہے پیشوا لیکر غنیمتِ موفور
کھینچیں کس لئے انگریز اپنے آپ کو دُور — کہ جس سے رکھتے تھے دل پر وُہ سینکڑوں ناسُور

پڑا تھا خاک پہ اس نامور کا لاشہ ہائے!
فلک یہ تو نے دکھایا ہے کیا تماشہ ہائے

وُہ بادہ جس کا کہ خانِ شہید تھا شیدا — وُہ نوش جس کو کہ تغلق نے ناپسند کیا
وُہ زہر جس کا کہ ہیموں نے پی لیا پیالہ — ازل کے دن سے یہ حصّہ نصیبِ ٹیپو تھا

مرا وُہ مَوت جسے کہئے عاشقانہ موت
سپاہی کہتے ہیں جس کو سپاہیانہ موت

بجا ہے اس کو جو بیداد گر کہیں انگریز — درست ہے جو اُسے بے ہُنر کہیں انگریز
روا ہے اس کو اگر بے خبر کہیں انگریز — رقیب کو ستم آرا اگر کہیں انگریز

کہ اس کے آگے چھلکتا رہا ایاغ فرنگ
جلا نہ سامنے اُس کے کبھی چراغ فرنگ

ہزاروں اُٹھ گئے دُنیا سے بے پھلے پھُولے ۔ وُہ ہونہار جو دنیا میں آئے اور نہ رہے
وُہ تازہ غنچے جو مُرجھا گئے بغیر کھلے ۔ اسی طرح سے گیا ٹیپو وقت سے پہلے

کہ اس کو موت ہی آئی شباب سے پہلے
پلایا زہر ہے اس کو شراب سے پہلے

رہا زمانہ میں کچھ روز میہماں کی طرح ۔ بہار اس کی جو آئی بھی تو خزاں کی طرح
چھپا نگاہوں سے وُہ گنج شائگاں کیطرح ۔ دلوں سے محو ہوا یاد رفتگاں کی طرح

کسی بشر نے نہ کی اُس پہ اشک افشانی
فرشتے گور پہ کرتے ہیں فاتحہ خوانی

بہار گائینگی جب بلبلیں گلستاں میں ۔ خزاں کا دور ہو جب موسم زمستاں میں
مقابلے پہ ہوں جب دو حریف میداں میں ۔ اُڑائیں ساغر مے جبکہ بزم یاراں میں

جہاں میں رسم ہی جب تک کہ شادی و ماتم
ہمیشہ روئیگا اس کے لئے سر نگا پٹم

ح۔ نسیم (ایف۔اے)

مذہب اور سائنس

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

چیخ کر بولا کہ اے سائنس کیا بکتا ہے تو ۔ سُن چکا ہوں میں تری از ابتدا تا انتہا
تیری باتیں سُنکے آتا ہے مجھے ناداں وُہ یاد ۔ بیٹھکر اک شاخ پر جو تھا اُسی کو کاٹتا
ہے اسی خلاق اکبر نے تجھے سب دی جو نی ۔ عقل و دانش ناز جس پر ہے تجھے اتنا بڑا

پر اسی کی ذات سے مُنکر ہُوا جاتا ہے تو
تجھ سا مُحسن کُش زمانے میں نہ دیکھا اور سُنا

حد سے بڑھکر علم پر اپنے نہ کر تو اعتماد
ورنہ چُندھیا دیگی تیری آنکھ کو اُس کی ضیا

آفرینش کی حقیقت سے نہیں آگاہ تو
عاقبت اور رُوح کا مطلق نہیں تجھ کو پتا

تو بتا سکتا ہے جسم و جاں میں رشتہ منفصل
کس جگہ ہوتا ہے اور گر ہے تو کیسا اور کیا؟

فلسفے سے میں ترے آگہ نہیں لیکن یہی
تو بتا دے مادہ کیا؟ وقت کیا ہے؟ کیا خلا؟

کیا یہ دُنیا دل میں ہے یا دل کے باہر بس رہی؟
ہر عمل کے واسطے ردِّ عمل کیونکر ہوا؟

کیا ثبوت اسکا ہے تیرے پاس میں رکھتا ہوں دل؟
کیا یہ سب کچھ محض اک دھوکا ہے اور مکر و دغا؟

یہ تو کہتا ہے یقیں پر ہے مری سب دار و گیر
علم ہے نزدیک تیرے۔ میں ہوں کوسوں بھاگتا

پر یہ لاعلمی مری بہتر ہے تیرے علم سے
وہم میرا ہے یقیں سے تیرے اعلیٰ برملا

تو بھی بزدل بنکے لے لیتا ہے لاعلمی سے کام
فرض کر لیتا ہے جب تجھ کو نہیں کچھ سُوجھتا

تُجھ کو اقلیدس کی صحت پر بڑا ہوگا گھمنڈ
گو ہے سارا علم موضوعہ اصُولوں پر بنا

جبکہ تو بھی اس مرض میں مبتلا ہے جس میں میں
ہر کس و ناکس سے کرتا ہے مرا پھر کیوں گلا

ہیں حواسِ ظاہری سے ترے معلومات سب
تجربہ ہادی ہے تیرا فیکٹ[1] تیرا رہنما

اُلٹی گنگا میں بہاتا ہُوں مجھے کیا علم سے
غیب و لاعلمی پہ ہے میں نے دھری اپنی بنا

غیب سے نکلا ہوں میں اور غیب میں جاتا ہوں میں
غیب میں بڑھتا ہُوں میں اور غیب مامن ہے مرا

قتل و خُوں کرنیکو دُنیا میں نہیں آیا ہوں میں
محض تیرا ہے یہ اک بہتان و کذب و افترا

خُوں کبھی میں نے نہیں کوئی کیا ہے۔ بلکہ میں
خونِ ناحق کرنے والے سے ہوں لیتا خوں بہا

تو کسی صورت نہیں ظلم و ستم میں مجھ سے کم
گر تری دانست میں میں نے کئے جور و جفا

ہے نئے ہتھیار تو ایجاد کرتا آئے دن
ڈھنگ لڑنے کا بتاتا ہے تو ہنگامِ وغا

تیری لی مٹفورڈ[2] نے اور مارٹینی نے تری
خُون کتنے بیگناہوں کا۔ بتا سچ سچ۔ پیا

---

[1] امرِ واقعہ ۱۲ [2] بندوق کی قسمیں ۱۲

کتنے معصوموں کو ہے اب تک کیا تو نے یتیم
کتنی خاتونوں کو تو نے آجتک بیوہ کیا

واسطے تیرے ہی لڑنے کے لئے آیا تھا جو
تیرا ہی ایجاد کردہ بمب ﷺ شل اسپر پھٹا

سچ بتا تجھ کو گلیلو اور ہرتل کی قسم
کیوں ہے پنجے جھاڑ کر تو یوں مرے پیچھے پڑا

گر مری تعلیم سے واقف ہو تو اچھی طرح
رنجشوں سے پاک ہو جائے ترا دل اور صفا

سینکڑوں روتے ہوئے آئے تری درگاہ سے
جنکو میں نے اپنی گودی میں لیا آخر بٹھا

سینکڑوں ناکام تیرے در سے آئے لوٹ کر
ٹھیک میں نے کر دیئے جن کے دماغوں کے قوا

جسمِ جنا کی اک ترازو ہے نہیں اس میں کلام
اور ستتنے نہیں اس سے دماغ انسان کا

اس میں ہیں نقطے ہزاروں عاملِ اعضائے جسم
اور ہزاروں جن میں جذبے دوڑتے ہیں دائما

ڈگمگا جاتی ہے ترکیبِ دماغی۔ گر نہ ہو
ایک نقطے کے مقابل اور مساوی دوسرا

ان نقاطِ قدرتی میں ایک ایسا بھی ہے جو
خواہشِ تحقیقِ حق میں رہتا ہے ہر دم لگا

پر نہیں خواہش کبھی اس کی ہوتی پوری نہ وہ
اس تذبذب سے ہے چھٹ سکتا جو ہے اسکا صلہ

کیا تذبذب میں ہی ساری زندگی کٹ جائے حیف
کیا یونہی کچھ جی کے انسان بعد میں مر جائیگا

ہائے اے ظالم تجھے اس کا نہیں کچھ بھی خیال
اس پریشانی کی حالت سے وہ ہو کیونکر رہا

دیکھ میں نے اسکی خواہش کے لئے جائز ہے جو
کر دیا ہے لا کے ایسی راہ پر اس کو کھڑا

جس کو کہتے ہیں شریعت میں صراطِ مستقیم
لڑکھڑاتا پھر نہیں اس پر کبھی پاؤں جما

نقطہ خواہش کو میں نے نقطۂ تسکین سے
کر دیا ساکن۔ جبھی تو تھا ابھی میں نے کہا

سینکڑوں ناکام تیرے در سے آئے لوٹ کر
ٹھیک میں نے کر دیئے جن کے دماغوں کے قوا"

بار دیگر شعرِ مذہب نے کہا جب یہ تو میں
بول اٹھا صد مرحبا صد مرحبا صد مرحبا

دونوں سائنس اور مذہب سے کہا میں نے شریف
ہو تو تم دونو۔ ولیکن وائے برحالِ شما

غیب میں مذہب مِنا تو چین اور سائنس تو
علم سے اپنے نکلکر غیب میں کیوں جا گھسا

اپنے اپنے دائروں میں کیوں نہیں رہتے۔ اگر
ان حدود اللہ کو توڑو گے پاؤ گے سزا

کام جو مذہب کا ہے سائنس وُہ تیرا نہیں
اور جو تیرا کام ہے مذہب نہیں سائنس کا

اِس لئے کج بحثیاں سب یہ تمہاری ہیں فضول
ہاں اگر کچھ کر دکھانا ہے تو اِس سے بڑھ کے کیا

اتفاقِ باہمی سے گر بڑھیں رُوح و دماغ
ہو فلاحِ دین و دنیا - اور تمہاری واہ وا

اچھا جاؤ چین سے مکر رہو اور مت لڑو
اَور تم سے کیا کہوں تم کو ہدایت دے خُدا

محمد اکبر خانؔ

دیوارِ کہن

"از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را"

ہوا میں رات قیامت کی سنسناہٹ تھی
اور اُس پہ تار کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی

مُجھکا اداس قمر جا رہا تھا مغرب کو
غریب پچھلے پہر جا رہا تھا مغرب کو

جگر یہ کھائے ہُوئے داغ بے ثباتی کا
کسی درخت کی شاخوں سے ہو رہا تھا جُدا

خراب و کُہنہ و شکستہ ایک تھی دیوار
تھے جس نے دیکھے لڑکپن کے میرے لیل و نہار

قریب اس کے میں اُس دم کھڑا ہوا تنہا
زمانہ اپنے لڑکپن کا یاد کرتا تھا

وہ دل فریب نہ صُورت نہ تھی وہ نقش و نگار
کھڑی ہُوئی تھی زمین پر نحیف و خستہ و زار

ہزار دِل سے بھلاتا تھا پچھلی باتوں کو
خیال یاد دلاتا تھا پچھلی باتوں کو

دکھا رہی مجھے عبرت تھی کس غضب کا سماں
خُدا دکھائے کسی کو نہ ایسی شب کا سماں

اُداس ہائے وُہ اس دم کی چاندنی ڈھلتی
بڑھا رہی تھی جو رہ رہ کے بیکسی اُسکی

بنا گئی مجھے کچھ ایسا محو نظّارا
زمانہ آنکھوں میں بچپن کا پھر گیا سارا

جمایا ایسا تصوّر نے رُوبرو نقشہ ___
دکھا دیا مجھے طفلی کا ہُو بہ ہُو نقشہ

رگیا تیرے آگے زمانہ اے دیوار!
کہ تیرے شہر میں سب سے قدیم ہیں آثار

ہے آج جو یہ بے مکین ویرانہ
بنا دیا ہے جسے بیکسی نے غمخانہ

ی زمانے میں عیش و طرب کا یہ گھر تھا
چہل پہل تھی غضب کی۔ غضب کا یہ گھر تھا

چہ اب نہ رہا بام و در کا وُہ نقشہ
مگر مجھے نہیں بھولا ہے گھر کا وُہ نقشہ

ں تھا صحن۔ وہاں سائباں۔ ادھر دالان
اُدھر کو آہ تھی اِک کوٹھری رفیع الشان

ر کو وہ مری خلوت تھی آہ! خوش منظر
پُرانے تاڑیہ آتے تھے جس جگہ سے نظر

گرمیوں میں یہاں آہ! شام کو اکثر
تھا لیٹتا کبھی ہلکی سی اِک مُسہری پر

چھوٹی چڑیوں کا کنگنی پہ تیری اے دیوار!
چہک چہک کے ہم آہنگیوں سے گانا ملار

لاڈلی مری بچپن کی فاختہ ہو کدھر
تھا آشیانہ کبھی آہ! جس کا کوٹھے پر

ب کی درد بھری جسکی تھی کبھی "گوگو"
تھی دوپہر کو جو سرگرم نالہ "یاہُو"

رگئی ہو نہ جی سے اجل نصیب کہیں
کہ اب نظر نہیں آتی مجھے غریب کہیں

کاش اُس کے پر و بال کا نشاں پاتا
تو پاس رکھ کے دلِ غمزدہ کو بہلاتا

ں پہ آہ! وُہ دالان تھا جو خوش منظر
مَیں گرمیوں میں جہاں محوِ خواب تھا اکثر

ی کی اِک یہ شکستہ ہے رہگئی دیوار
اُسی کی ہائے! یہ خستہ ہے رہ گئی دیوار

ں تو راتوں کو جلتے تھے خوشنما فانوس
یہیں بلور کے روشن تھے جابجا فانوس

ں کے فرش پہ مَیں لوٹتا تھا بچپن میں
کہ چاندنی میں یہیں کھیلتا تھا آنگن میں

نی برستی تھی دیوار! تیرے منظر سے
کہ تجھ کو آہ! محبت تھی میرے گھر بھر سے

ری رفیق تھی۔ اور میری ہمخیال تھی تو
کہ رنج و عیش میں میری شریکِ حال تھی تو

تھا اُن دنوں ساون میں جب مرا بھائی
اُداسی چہرے پہ گھر بھر کے غم میں تھی چھائی

ہوا تھا میں اِک کھری چارپائی پر
ملول و خستہ و ماتم زدہ۔ پسیٹے سر

غمزدہ سی تھی اسوقت تو بھی اے دیوار!
اُداس مجھ کو نظر آتے تھے تیرے رخسار

جگر خراش فسانہ وہ یاد ہے اگلا
کہ گرمیوں کا زمانہ وہ یاد ہے اگلا
وہ چلچلاتی ہوئی دھوپ جیٹھ کی۔ وہ سموم
وہ دل ملول۔ وہ چہرہ فسردہ و مغموم
تھپے دے رہے مجھے جب گرمیوں کے دن آکر
تو ہو رہی تھی پریشان تو بھی اے دیوار

کدھر ہے آہ! وہ عہد گذشتہ اے دیوار!
گذر گئے مری طفلی کے کیا وہ لیل و نہار؟
وہ کم سنی کا زمانہ نہ آئے گا پھر کیا؟
وہ دن نہ مجھ کو زمانہ دکھائیگا پھر کیا؟
نسیم دے کے ہوا مجھ کو اپنے دامن کی
وہ میٹھی نیندیں سلائیگی کیا نہ بچپن کی!
پسند آہ! تھیں جب کھیل کود کی باتیں
پلٹ کے کیا نہ وہ آئینگی چاندنی راتیں!
رہا نہ آہ! وہ اگلا سا خوشنما چہرہ
اداس اب نظر آتا ہے چاند کا چہرہ
ہیں تیوریاں بھی تو تاروں کی آہ! بدلی سی
دکھائی دیتی ہے مجھ کو نگاہ بدلی سی
برادر و پدر و خویش و اقربا و عزیز
بدل گئی مری بچپن کی ہائے اک اک چیز
جب آہ! ہو گئیں ان سب کی صورتیں تغئیر
تو کیا عجب ہے جو تیری بدل گئی تعمیر
مگر ہے آہ! یہ کیا کم تیری وفاداری
نباہے جاتی ہے بچپن کی شرط غمخواری
اگرچہ تجھ کو زمانے نے کر دیا ہے نزار
بری نہیں ہے مگر اپنے جی سے تو دیوار!
کہ آج بھی تو مجھے سہ پہر کو اے غمخوار!
پناہ دینے کو سائے میں اپنے ہے تیار
وہ چھوٹے چھوٹے ترے ہائے! خوشنما پتھر
ہیں شیفتہ کبھی بچپن میں آہ! تھا جن پر
وہ کم سنی کی تیری غمگسار ٹھیکریاں
وہ دل میں چبھتی ہوئیں نوکدار ٹھیکریاں
جو مجھ سے نوک کی بچپن میں لیتی تھیں اکثر
نہیں ہے ان کی کوئی آج لینے والا خبر
ہے آفریں تیری ہمت کو۔ لیکن اے دیوار!
کہ بیکسی میں بھی تو آج ان کی ہے غمخوار
ملول و بیکس و افسردہ و فراق نصیب
پڑے ہوئے ترے سائے میں آج بھی ہیں غریب

بجا ہے آہ! یہ میرا خیال کیا دیوار!
کہ تو مجھے بھی نہ بھولی ہو اے مری غمخوار!
مگر یقین مرے دل کو آہ! کیوں کر ہو
کہ میری یاد ابھی نقش تیرے دل پر ہو

را کرے مجھے اے کاش! تو نہ بھولی ہو
رچہ دُور رہا تجھ سے میں فراق نصیب
ذر گئے تری فرقت میں آہ! کتنے سال
ں گو رہین ستمہائے روزگار رہا
مانہ یاد لڑکپن کا جب کبھی آیا
لے تھے مجھ کو جو طفلی کے آہ! دن و چار
ہی نے مجھ کو سکھائے خرام کے انداز
ہ چھوڑ دینا لڑکپن میں مجھ کو دائہ کا
فا کے اگلے وہ پیمان یاد ہیں تیرے
ل کے جب کسی شئے پر میں رُوٹھ جاتا تھا
تجھ سے لگ کے میں ہو جاتا تھا کھڑا دیوار!
داس دیکھ کے مجھ کو گلے سے لپٹا کر
میں ہوں آہ! لڑکپن کی وہ ادا بھولا
رے رفیق نہ جب کھیلنے کو آتے تھے
ستی ہوتی تھی جب گھر میں مینہہ کی بوچھا
نجھے میں گیند تھا دیتا مجھے تو دیتی تھی
ذر گئی مری طفلی تو آہ! کتنی جلد
یا نہ ساتھ جو طفلی نے میرا اے غمخوار!
میں نے جانا کہ بچپن نہ پھر مرا آتا
وتا جو کاش! ضعیفی سے قد مرا ہوتا
لا رہی ہے لہو مجھ کو تیری حالت زار

مجھے بھی آہ! تری آرزو نہ بھولی ہو
اگرچہ سائے سے تیرے بچھڑ گیا میں غریب
رہا میں وادیٔ غربت میں آہ! کتنے سال
ترے خیال سے غافل نہ زینہار رہا
ترا خیال وہیں بنکے بیکسی آیا
وہ گذرے گود میں تری ہی اے میری غمخوار!
تجھی نے مجھ کو بتائے خرام کے انداز
ترے سہارے سے چلنا وہ سیکھنا میرا
مُربیہ! مجھے احسان یاد ہیں تیرے
کسی کی گود میں جب آہ! میں نہ آتا تھا
لگا کے تجھ سے میں روتا تھا غمزدہ رُخسار
لگا کے سینے سے۔ آنسو تھی پونچھتی اکثر
میں جب بڑا ہوا۔ اور گیند کھیلنا سیکھا
نکل کے گھر سے کہیں ابر میں نہ جاتے تھے
تو کھیلتا تھا میں اُسوقت تجھ سے اے دیوار
بلائیں دُور سے ہو کر نثار لیتی تھی
بدل گئی تری ظالم! نگاہ کتنی جلد
تو کاش! ویسی ہی بچپن کی رہتی تو دیوار
مگر نہ آہ! زمانہ شباب کا آتا
تو تجھ سے تکیہ لگانے کا آسرا ہوتا
کہ کچھ دنوں کی تو مہماں ہے اے مری غمخوار!

جگر میں زخم ہیں - پہلو میں سینکڑوں ناسور — نہ تمکنت ہے نہ اب وہ شباب کا ہی غرور
جُھکا رہی ہے بڑھاپے کی کیا زمیں گیری — ملا کے خاک میں چھوڑے گا عالمِ پیری
تھا اتفاق کہ تیرے قریب آ نکلا — اِدھر کو بھول کے مَیں غم نصیب آ نکلا
نصیب پھر ترا دیدار دیکھئے کب ہو — اُدھر کو عزمِ دلِ زار دیکھئے کب ہو
جُدا میں ہوتا ہُوں تجھ سے ترا خدا حافظ! — نکلتی ہے مرے دِل سے دُعا خدا حافظ!
ہُوا لپٹ کے جو دیوار سے جدا میں غریب — دکھا کے پیٹھ جو چپ چاپ چل دیا میں غریب
نگاہِ یاس سے پہلے مری طرف دیکھا — زبانِ حال سے پھر یُوں کہا کہ اَے بیٹا!
تمام زیست کے دن ہو چکے - اجل ہے قریب — کہ پاؤں قبر میں لٹکائے بیٹھی ہُوں میں غریب
ہُوں میہمان کوئی دن کی - قضا ہے سر پہ سوار — نصیب تم کو نہ شاید ہو پھر مرا دیدار
مگر نہ دِل سے بھلانا مری وصیّت کو — کہ چھوڑے جاتی ہوں میں یادگارِ عبرت کو
جب آہ! مجھ کو نہ تم اس جگہ کھڑا پاؤ — زمیں پہ خاک کا پُتلا مرا پڑا پاؤ
تو مجھ پہ ہو کے نہ اٹھلا کے یُوں گذر جانا — کہ بے رُخی کہیں عبرت سے تم نہ کر جانا
نہ بھول کر بھی اسے دیکھنا حقارت سے — کہ پاک تر نہیں صحبت ہو کوئی عبرت سے

(سرمد جہان آبادی)

غزل

فغان و آہ کس امید پر کرے کوئی — وہ کہتے ہیں ترے نالوں سے کیوں ڈرے کوئی
یہی بدا تھا مقدر میں روزِ اول سے — کسی کے حُسنِ جہاں سوز پر مرے کوئی
بتوں سے کس کو اُمیدِ وفائے اُلفت ہے — عبث کسی کی محبّت کا دم بھرے کوئی
تری جفاؤں سے اُکتا کے دل کو سمجھایا — یہ نامراد نہ مانے تو کیا کرے کوئی
سکھا دیا ہے کہیں آس پاس والوں نے — کسی سے رہنے لگا ہے پرے پرے کوئی
سوالِ وصل نہیں شرحِ شوقِ دید نہیں — تمہارا حرج اگر تم پہ یُوں مرے کوئی؟
پیامِ مرگ ہے عشقِ پری رُخاں تیر نگ — نہ ہو یہ روگ تو کیوں بے اجل مرے کوئی

(حبیب)

اپریل نمبر کی چند خصوصیتیں

اپریل سنہ۱۹۰۹ء کے مخزن میں سلطانِ عالم واجد علی شاہ مرحوم کے خطوط کا ایک دلچسپ اور نادر سلسلہ شائع ہونا شروع ہوگا - یہ وہ خطوط ہیں جو مرحوم شاہ اودھ نے کلکتے سے نواب ممتاز جہاں جلیل محل صاحبہ کو لکھے - یہ خط وکتابت آجتک کہیں شایع نہیں ہوئی اور ہمیں بڑی دقت اور کاوش سے دستیاب ہوئی ہے - اس نایاب خط وکتابت کے شائقین کو چاہیئے کہ اپریل سے جس میں پہلا خط شائع ہوگا باقاعدہ طور پر رسالے کو منگوانا شروع کردیں -

علاوہ ازیں

اسی نمبر میں حضرت داغ مرحوم پر پروفیسر اقبال صاحب کی ایک بے نظیر نظم - میر نیرنگ صاحب کا ایک تنقیدی مضمون - اور جناب احسن مارہروی (مصنفِ جلوہ داغ) کا ایک پرزور مرثیہ شائع ہوگا - اور اسی پرچے کے ساتھ اُستاد مرحوم کی ہاف ٹون تصویر بھی ہدیہ ناظرین ہوگی - شائقین ابھی سے خریداری کے لئے لکھ بھیجیں -

چونکہ ہم مقررہ تعداد سے زائد پرچے بہت نہیں چھاپتے اس لئے اگر بعض اصحاب کچھ عرصے بعد اس سلسلے کو مکمل اپنے پاس رکھنے کی خواہش کرینگے اور پچھلے نمبر طلب فرمائینگے تو عجب نہیں کہ انہیں مایوس ہونا پڑے -

اور انہی خصوصیتوں کی وجہ سے آئندہ تمام مضامین کے جملہ حقوق محفوظ ہونگے - اور رسالہ باضابطہ رجسٹری کرادیا جائیگا ٭

مینیجر مخزن

ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو آر گرایپر صاحب بہادر
الیف - سی - ایس - اے - آر - ایس - ایم - فیلو آف کمسٹری لنڈن

جسکی نسبت لنڈن و کلکتہ و پنجاب و آگرہ میڈیکل کالج کے سندیافتہ معزز ڈاکٹروں و نوابوں و راجاؤں کے معزز حکیموں و صاحبان جج بہادر و مجسٹریٹ بہادر و صاحبان ڈپٹی کلکٹران بہادر و معزز یورپین صاحبان انگریز بہادر وغیرہ نے بعد تجربہ و استعمال کے ہم کو یہ لکھا ہو کہ آپ کا ممیرہ و سچے موتیوں کا سفید سرمہ آنکھوں کی بیماریوں و ترقی روشنی کے واسطے بہت مفید اور سب سے بہتر و زود اثر دوا ہو - کہ جس کے سارٹیفکیٹ بوقت فرمائش آپ کی خدمت میں ہم خود بھیجیں گے - ممالک روس وغیرہ کے معزز ڈاکٹران و حکیم آنکھوں کی بیماریوں میں اور دوا کو چھوڑ کر ہماری اس دوا کو استعمال کرتے ہیں - ہم نے اصلی و عمدہ ممیرہ بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگایا ہے

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اس میں جلد کامیابی

نگاہ ناپ کر ہمارا سرمہ لگایئے دو ہفتے میں روشنی آنکھ بہت بڑھ جائیگی اور آنکھ کے جملہ نقص دور ہو جائینگے - (۲) عینک کی ضرورت نہیں (۳) دھند - دھلکہ - آنسو بہنا - سردی - سوزش - کھجلی - آنکھ کے سامنے کا اندھیرا پلکوں کے اندر کے دانے و سرخی - گوہانجی (۱۲) لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کا تکان - درد بہت جلد شرطیہ رفع کرتا ہو - (۱۴) کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا بہت جلد چھوٹ لیجئے - پڑوال - پٹبل - جالا - پھولی - ابتدائی موتیابند - ناخونہ گرے (۲۱) آنکھوں میں سرخ ڈورے پڑجانے کو (۲۳) پلکیں گرجانے والی بیماری کو مفید ہے - کمزور آنکھ کو قوت دیتا ہو - آنکھوں کا میل اور مواد صاف کرتا ہو اور جملہ امراض سے محفوظ رکھتا ہو - قیمت فی تولہ تین روپیہ علاوہ محصول

المشتہر رام سرن نگم - کانپور

اپنا نام و مقام و نام ڈاک خانہ و ضلع خوشخط لکھو - ورنہ تعمیل نہ ہوگی -

چند معزز اور قابل قدر و لائق اطمینان شہادتیں

(۱) عالیجناب ڈاکٹر ای - وائی رودر صاحب بہادر آر ڈی - ایم - پی - ایل - لنڈن -

(۲) جناب ڈاکٹر ایچ - پی - بنرجی صاحب ایل ایم ایس وسرجن کلکتہ

(۳) جناب ڈاکٹر پی - این - بنرجی صاحب ایل ایم ایس اسسٹنٹ سرجن میرٹھ -

(۴) جناب ڈاکٹر اللہ یار خانصاحب ایس جی سی - اڈیشنل اسسٹنٹ ضلع بجنور

(۵) جناب ڈاکٹر عبد الصمد خانصاحب اڈیشنل اسسٹنٹ ضلع کانپور

(۶) عالیجناب شمس العلما خان بہادر جناب مولوی محمد ذکاء اللہ خانصاحب پروفیسر سابق میور کالج الہ آباد

(۷) جناب مولوی فصیح الدین احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر اسسٹنٹ مہتمم بندوبست کانپور

(۸) عالیجناب میر حمزہ حسین صاحب بی - اے - بی - ایل سب جج بہادر بمقام منگلور

(۹) عالیجناب مولوی سید حامد حسین صاحب منصف درجہ اول ضلع ہمیرپور

(۱۰) عالیجناب منشی و نیت لال صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر ضلع بستی

(۱۱) عالیجناب مسٹر بن بہاری صاحب مکرجی ایم اے - ایل ایل - بی سشن جج بہادر گونڈا -

(۱۲) عالیجناب مسٹر ایل وہب صاحب بی اے - بی ایل جج خفیفہ بہادر کانپور

(۱۳) عالیجناب مسٹر شب شنکر لال صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ بہادر بمقام منہ لکھیسر

(۱۴) عالیجناب مسٹر جی ڈاربی صاحب بہادر اڈیٹر نارتھ ویسٹ گزٹ کانپور

(۱۵) عالیجناب جی ہاگ صاحب بہادر انجنیر ریلوے